ماہنامہ
اگست 2024ء
طلوعِ اسلام
لاہور
اشاعت کا اِسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ
کی خواہش پر 1938ء سے شائع
ہونے والا ماہنامہ

جشنِ آزادی مبارک



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوبِ تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
اگست 2024ء

جلد 77 شمارہ نمبر 8

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: نظریۂ پاکستان کا مفہوم متعین کیوں نہیں کیا جاتا؟	ادارہ	4
اسلام کے مقابل اسلام	غلام احمد پرویزؒ	6
علامہ محمد اقبالؒ کا دوسرا خواب	شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ	32
حکمت کی باتیں (انتخاب از خطباتِ اقبال)	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	44
تفرقہ عذاب ہے یا اجزاء الخیر	ڈاکٹر شگفتہ طاہر، کراچی	50
اقبالؒ کا شاہین ہو کہ پرویزؒ کا سلیم (گذشتہ سے پیوستہ)	نفیسہ فریاد چاہل	56
سانحہ ارتحال	ادارہ	60

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

نظریۂ پاکستان کا مفہوم متعین کیوں نہیں کیا جاتا؟

دنیا میں سب سے بڑا عذاب، کسی قوم کا تذبذب یا تعلق (Suspense) کی حالت میں رہنا ہے۔ کسی خطرہ کا سامنے آ کر کھڑے ہو جانا اتنا وجہ اضطراب نہیں ہوتا جتنا اس کے متعلق عدمِ یقین کا یہ عالم کہ۔۔۔ اب چھری صیاد نے لی، اب قفس کا در کھلا۔۔۔ جہنم کا یہی وہ شدید ترین عذاب ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: یَاۡتِیۡہِ الۡمَوۡتُ مِنۡ کُلِّ مَکَانٍ وَّمَا ہُوَ بِمَیِّتٍ (14:17) وہاں موت ہر طرف سے آتی دکھائی دے گی لیکن موت آئے گی نہیں۔ بیم و رجا اور عدمِ تیقن کا یہی وہ جہنمی عذاب ہے جس میں یہ سوختہ بخت قوم گرفتار چلی آ رہی ہے اور یہ سال تو ایسے کرب و الم میں گزر رہا ہے جیسے کسی پھانسی پانے والے کی اپیل زیرِ غور ہو۔ غالب نے کبھی کہا تھا کہ ؎

ہمہ ناامیدی، ہمہ بدگمانی میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

اس میں شبہ نہیں کہ یہ بدنصیب خطۂ زمین، جس اضطراب و خلفشار سے اب گزر رہا ہے، یاس و ناامیدی کی جو مرگ آفریں تاریکی اس کی فضا کو اس وقت محیط ہے۔ عدمِ سکون و فقدانِ اطمینان کا جو کرب انگیز عالم اس وقت ہے، قانون شکنی و جرائم کیشی جس حد تک اب عام ہو رہی ہے، حال جس قدر تاریک اور مستقبل جس قدر تاریک تر نظر آ رہا ہے، پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا لیکن اس کے باوجود ہمیں افسردہ خاطر اور ناامید نہیں ہونا چاہئے۔ جیسا کہ ہم روزِ اول سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اس خطۂ زمین کے ساتھ، فطرت کا کوئی خاص پروگرام وابستہ نظر آتا ہے۔ یہ جس طرح ہمیں حاصل ہوا، اس میں بھی فطرت ہی کا ہاتھ کام کر رہا تھا اور اس کے بعد جس طرح یہ ان متعدد زلزلہ انگیز دھچکوں سے محفوظ رہا جن میں سے ہر دھچکا، بڑی سے بڑی مستحکم مملکت کی بنیادوں تک کو ہلا دینے کے لئے کافی تھا اس میں بھی کچھ ادھر ہی کا اشارہ کارفرما رہا ہے۔ ان مہیب زلزلوں میں سب سے زیادہ پرخطر اور تباہ کن وہ تھا جو مشرقی پاکستان میں رونما ہوا لیکن دستِ قدرت نے جس سے ہمیں بال بال بچا لیا۔

سوچئے کہ ہم کس طرح مجیبؔ کی منتیں کرتے اور اس کے پاؤں پڑتے تھے کہ وہ اپنی حکومت قائم کرے! کیا ہماری یہ کوششیں، اس مملکت کو خود اپنے ہاتھوں، ہندو کے حوالے کر دینے کے لئے نہیں تھیں اور کیا اس خطرہ سے ہمیں فطرت کے دستِ تصرف کے سوا کوئی اور بھی محفوظ رکھ سکتا تھا۔ کیا دنیا کا زیرک سے زیرک ماہر سیاست دان یہ بتا سکتا ہے کہ مجیبؔ کی سمجھ میں ایسی کھلی ہوئی بات کیوں نہ آ سکی اور اس کی عقل و ہوش پر اس قدر دبیز پردے کیوں پڑ گئے! انسانی منطق اس کا جواب نہیں

دے سکتی۔ اس کا جواب خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہی دے سکتا ہے جو کہتا ہے کہ: وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ (35:43)۔ تخریبی چالیں چلنے والا' آخرالامر' اپنے جال میں خود آپ پھنس جاتا ہے اور جب اس کا وقت آ جاتا ہے تو وہ کتنا ہی ہوشیار اور چالاک کیوں نہ ہو فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ (46:26) اس کی عقل وخرد اور ہوش وحواس کچھ کام نہیں دیتے۔ ان پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ مجیبؔ کی عقل و ہوش کو تعزیرِ فطرت نے مصلوب کر دیا اور پاکستان اس کی نہایت خطرناک سازش سے بچ گیا۔

یہ ہیں وہ محیر العقول واقعات جن کی بنا پر' ہم کہتے ہیں کہ فطرت کا کوئی پروگرام اس خطۂ زمین کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی لئے ہماری مجرمانہ تغافل شعاریوں اور تخریبی کوششوں کے علی الرغم' یہ بار بار محفوظ رہ رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی فطرت کا یہ فیصلہ بھی ہمارے سامنے ہے کہ جب کوئی قوم' ان (Chances) سے فائدہ نہ اٹھائے اور اپنی روش میں تبدیلی پیدا نہ کرے' تو يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾ (47:38) وہ اس کی جگہ کوئی دوسری قوم لے آیا کرتی ہے جو اس جیسی نہیں ہوتی۔ یہی وہ اصولِ خداوندی ہے جس سے ہمیں ڈر لگتا ہے کہ وہ ہمیں اس قسم کے مہلت کے وقفے بار بار نہیں دے گا۔

نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ جیت جانے سے بھی پاکستان کے تحفظ کا مسئلہ حل نہیں ہو جائے گا۔ جنگ جیت جانے سے اس کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت ہو سکتی ہے لیکن اس کی بقا کا راز تو اس کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت میں ہے لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ یہ قوم ابھی تک ان نظریاتی سرحدوں کا تعین ہی نہیں کر سکی اس لئے ان کے تحفظ کا سوال کہاں سے پیدا ہوگا۔ ان کا تعین کچھ مشکل نہیں لیکن اس سے دانستہ اغماض برتا جا رہا ہے کیونکہ جب یہ حدیں متعین ہو جائیں گی یعنی نظریۂ پاکستان کا مفہوم متعین ہو جائے گا تو قوم کو ان حدود کے اندر رہنا پڑے گا۔ اور یہی چیز قوم کے مفاد پرست گروہوں پر سخت گراں گزرتی ہے۔۔۔ قوم کے اربابِ سیاست پر بھی اور عمایدِ مذہب پر بھی۔ یہ ہے وہ حقیقی سبب جس کی وجہ سے نظریۂ پاکستان کا مفہوم متعین نہیں کیا جاتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے تِرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!

نظریۂ پاکستان' قرآن کے دو لفظوں میں یہ ہے کہ: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48) حکومت' خدا کی کتاب (قرآن) کے مطابق قائم کرو۔ بس یہ ہے نظریۂ پاکستان جس کی تشریح قائداعظمؒ نے ان جامع و مانع الفاظ میں فرمائی تھی۔

''اسلامی حکومت قرآنی اصول واحکام کی حکمرانی کا نام ہے۔''

یہ ہے نظریۂ پاکستان۔۔۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48) جس کے معنی ہیں قرآنی اصول واحکام کی حکمرانی۔

لیکن یہاں ہر گروہ' ہر پارٹی' ہر فرقہ' ہر حکومت نے اس نظریہ کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کی اور اسی سے پاکستان چاروں طرف سے خطرات کے گرداب میں گھر گیا۔ اب اس کے تحفظ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس نظریہ کو قوم کا نصب العین حیات قرار دیا جائے۔

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے!

اسلام کے مقابل اسلام

قائداعظم کے یومِ پیدائش کی تقریب، منعقدہ 24 دسمبر 1982ء پر پرویزؒ صاحب کا خصوصی درس

غالبؔ نے اپنے متعلق کہا تھا کہ ــــ ''قدرِ شعرِ من بگیتی، بعدِ من خواہد شدن ــــ دنیا میں میرے شعر کی قدر میرے بعد ہوگی ــــ اقبالؔ نے بھی اسی احساس کا اظہار کیا تھا جب کہا تھا کہ ــــ من ندائے شاعرِ فرداستم۔ ''میں آنے والے شاعر کی آواز ہوں۔ میرا زمانہ میرے بعد آئے گا۔'' مَیں اپنے آپ کو ان اربابِ فکر و بصیرت کے زمرے میں شمار کرنے کی جرأت تو نہیں کرسکتا، لیکن اس حقیقت کے اظہار سے باز بھی نہیں رہ سکتا کہ جو کچھ میں اسلام کے متعلق کہہ رہا ہوں وہ آنے والے مؤرخ کے لئے یادداشت کا کام دے گا۔ وہ دیکھے گا کہ جب یہاں اسلام پر یہ کچھ بیت رہی تھی تو ایک گوشے سے قرآن کی آواز بھی بلند ہو رہی تھی۔ قرآن کریم نے اپنے اولین مخاطبین (کفار) کے متعلق کہا تھا کہ وہ اپنے گروہ کے لوگوں سے کہتے تھے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ (41:26)۔ تم اس قرآن کی آواز اپنے کان میں نہ پڑنے دو۔ وَالْغَوْا فِيْهِ (41:26) اور اس قدر شور مچاؤ کہ دوسرے بھی اسے سُننے نہ پائیں۔ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (41:26) بس یہی ایک طریق جس سے تم، قرآن کی طرف دعوت دینے والوں پر غالب آسکو گے۔ اگر لوگوں نے اس کی آواز سن لی تو پھر وہ تمہارے قابو نہیں آسکیں گے۔ یہی ٹیکنیک ہمارے زمانے کے اس ہجوم نے اختیار کر رکھی ہے جو نہیں چاہتے کہ قرآن کی آواز بلند ہونے پائے۔ قرنِ اوّل کے معاندین کے مقابلہ میں ان کے پاس پراپیگنڈہ کے بڑے وسیع اور شدید الاثر ذرائع ہیں۔ عوام ویسے ہی جذباتی ہوتے ہیں۔ اس پراپیگنڈہ نے ان کے جذبات کو اس قدر دو آتشہ بنا دیا ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر آتش گیر مادہ بن جاتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے دانشور طبقہ کا تعلق ہے، جو کچھ اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے، اس سے وہ مذہب کے نام سے متنفر یا کم از کم (Disinterested) ہو چکے ہیں۔ میرے زمانۂ ملازمت کی بات ہے۔ دفتر میں ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ تھا اور اس کے سیکشن میں ایک ''احمدی'' کلرک۔ ''احمدیوں'' کا تو یہ معمول ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک تک اپنا لٹریچر پہنچاتے ہیں۔ ایک دن اس کلرک نے اپنا کچھ لٹریچر اس سپرنٹنڈنٹ کو دیا۔ اس نے پوچھا کہ یہ لٹریچر کس موضوع سے متعلق ہے؟ اس نے کہا کہ یہ مذہب سے متعلق ہے۔ اُس نے وہ کاغذات اس کی طرف لوٹا دیئے اور کہا کہ انہیں گرجا کے پادری کے پاس لے جاؤ، اسے اس کام کی تنخواہ ملتی ہے۔ مجھے نہیں، ہمارے دانشور طبقہ کی حالت کچھ ایسی ہی ہو چکی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ

مذہب ایک ایسا (Subject) ہے جس کا تعلق مولوی صاحبان سے ہے۔ ان سے اُس کا کچھ واسطہ نہیں۔

وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس، مسٹر جسٹس آفتاب حسین نے اس بارے میں گلہ بھی کیا ہے انہوں نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ملک کے علماء اور دانشوروں سے اپیل کی کہ وہ ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے وفاقی شرعی عدالت سے تعاون کریں۔ انہوں نے کہا کہ:

''انہوں نے بارہا اخبارات میں اشتہارات بھی شائع کروائے لیکن ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے سلسلے میں وکلا اور علماء حضرات نے کسی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں دکھایا۔ انہوں نے کہا کہ ''علماء زبانی کلامی تو اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے بہت کچھ کہتے ہیں لیکن عملاً انہوں نے تعاون کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وفاقی شرعی عدالت کی دعوت پر چند علماء نے کچھ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے سلسلے میں اپنی آراء پیش کی تھیں لیکن انہوں نے اپنی اس رائے میں صرف فقہ کو تحریر کر دیا تھا اور اکثر جگہوں پر قرآن اور حدیث کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اس لئے ان کی آراء ہماری مناسب مدد نہیں کر سکیں۔ انہوں نے کہا کہ وکلاء بغیر فیس کے کوئی مشورہ نہیں دیتے، اس لئے وکلاء نے وفاقی شرعی عدالت سے بھی قابل ذکر تعاون نہیں کیا۔'' (روزنامہ جنگ، لاہور، مورخہ 19 نومبر 1982ء)

یہ اُس طبقہ کا حال ہے جس کا براہ راست تعلق مذہب اور قوانین سے ہے۔ اس سے مذہب کے ساتھ دلچسپی کے متعلق دیگر طبقات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اندریں حالات آپ سوچئے کہ قرآن کی جو آواز میں بلند کر رہا ہوں اس پر کون کان دھرے گا؟ عوام سے کہہ دیا گیا ہے کہ ''یہ کفر ہے۔ الحاد ہے۔ بے دینی ہے۔ اس کے قریب تک نہ جانا۔'' خواص نفسِ مذہب ہی سے لاتعلق ہو چکے ہیں۔ بایں ہمہ میں اس آواز کو بلند کئے جا رہا ہوں۔ ایک تو اس لئے کہ میں نے اسے اپنی زندگی کا فریضہ قرار دے رکھا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ اس قحط الرجال کے باوجود، ایسے سعادت مند حضرات موجود ہیں جو اس آواز میں دلچسپی رکھتے ہیں اور تیسرے اس لئے کہ میری یہ آواز ریکارڈ میں رہے تا کہ آنے والا مؤرخ اس سے استفادہ کر سکے۔ (ورنہ) جہاں تک قرآن کے ساتھ اس دور کا عمومی تعلق ہے، اس کی حالت ایسی ہو چکی ہے جس کا اقبالؔ نے ان حقیقت افروز لیکن نہایت حسرت افزا الفاظ میں اظہار کیا تھا کہ ___ خوابم زیاد رفتہ و تعبیرم آرزوست ___ میں نے جو خواب دیکھا تھا وہ تو بھول گیا ہے لیکن میں یہ آرزو دل میں لئے بیٹھا ہوں کہ اس کی تعبیر میرے سامنے آ جائے۔

اقبال کا خواب:

اقبالؔ نے ایک خواب دیکھا تھا۔ یہ خواب کہ اللہ تعالیٰ نے جو دین (نظامِ حیات) حضور ﷺ کی وساطت سے نوعِ انسان کو عطا فرمایا تھا اور جسے آپ ﷺ نے عملاً نافذ کر کے دکھا دیا تھا، اسے پھر سے زندہ حقیقت بنا کر دُنیا کو بتا دینا چاہئے کہ یہ ہے وہ فردوسِ بریں جسے بنی آدم نے تم کو دیا تھا۔ اس نے کہا کہ جو اسلام، مسلمانوں کے مختلف ممالک میں رائج چلا آ رہا ہے،

وہ دین نہیں جو صدرِ اوّل میں قائم ہوا تھا۔ یہ وہ مذہب ہے جو صدرِ اوّل کے بعد ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ حقیقی دین کے احیاء کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا خطۂ زمین ہو جس میں پہلے سے کوئی نظامِ حیات ثبت نہ ہو۔ اس میں قرآن کی بنیادوں پر اسلامی نظام قائم کیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے 1930ء میں اس خطۂ زمین کے حصول کو قوم کے سامنے بطورِ نصب العین رکھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

> ''اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ اُن اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اس پر اب تک قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔'' (خطبۂ صدارت، الٰہ آباد)

اس سے بھی پہلے انہوں نے اپنے ''خطباتِ تشکیلِ جدید'' میں سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہم نوائی میں کہا تھا:۔

> اندریں حالات ہمارے لئے کشادِ کار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور دُرشت تہیں جم گئی ہیں اور جن کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے، انہیں کھُرچ کھُرچ کر الگ کر دیا جائے، اور حُریّت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو ازسرِ نو زندہ کر کے ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔ (چھٹا خطبہ)

وہ جانتے تھے کہ اس اسلام کی سب سے زیادہ مخالفت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوگی۔ کیونکہ مذہب ان کے لئے ذریعۂ معاش بن چُکا ہے، اور جب حکومت کے ساتھ ان کی ساز باز ہو جائے تو یہ ذریعۂ معاش ہی نہیں رہتا، وجۂ حصولِ اقتدار بھی بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس حقیقی اسلام میں اس انسٹی ٹیوشن کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ آپ کلامِ اقبالؒ کو شروع سے اخیر تک دیکھ جایئے۔ اس میں آپ کو مُلّا کی مخالفت، شدومد سے ملے گی۔ وہ ان کے وجود کو مسلمانوں کی تباہی کا اولیں سبب قرار دیتے ہیں۔ وہ مسلمان سے واضح طور پر کہتے ہیں کہ ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کُشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

اپنے کلام کے علاوہ، وہ دیگر مقامات پر بھی اسی خطرہ کو دُہراتے رہے۔ اُنہوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس (منعقدہ مارچ 1932ء) میں اپنے خطبۂ صدارت کے دوران فرمایا:

ملائیت کے خلاف:

ہمارے دین کی یہ بلند فطرتی مُلّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے، اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم جذبات اور حالات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں۔ جسے صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر رکھا

ہے۔ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تا کہ وہ پھر نئی آرزوؤں نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس نئی مملکت کے نظام کی بنیاد قرآن خالص ہوگی۔اور یہی چیز ہماری مذہبی پیشوائیت کے لئے بناءِ مخالفت ہوگی۔اس لئے ان کا مقابلہ کرنا بڑی جرأت طلب اور صبر آزما مہم ہوگی۔انہوں نے اپنے خطبات میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:

''یہ سوال زُود یا بدیر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں۔یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہئے بشرطیکہ اسلامی دُنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر بڑھے۔۔وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا اور حُریت پسند قلب ہے جسے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:

حسبنا کتاب اللہ

ترجمہ: ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

وہ جانتے تھے کہ جس نظام کی بنیاد قرآنِ خالص پر ہوگی وہ دنیا کے ہر غیر قرآنی نظام کا مخالف ہوگا۔اس میں ہر قسم کی شخصی حکومت کی مخالفت ہوگی خواہ وہ ملوکیت ہو یا آمریت، حتیٰ کہ مغرب کی جمہوریت بھی۔اس میں مغرب کی استعماریت کی بھی مخالفت ہوگی۔اور وطن اور نسل کی بنیادوں پر نیشنلزم کی بھی۔اس میں نہ مغرب کا نظامِ سرمایہ داری بار پا سکے گا نہ ہی روس کا اشتراکی نظام۔

ہر طرف سے مخالفت:

اس اعتبار سے اس جدید مملکت کی مخالفت مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت ہی کی طرف سے نہیں ہوگی۔بلکہ دُنیا کی ہر قوم کی طرف سے ہوگی۔بنابریں انہیں اس کا احساس تھا کہ اس مملکت کے قیام اور استحکام کی مخالفت ہر قوم کی طرف سے ہوگی۔کوئی قوم بھی اسے برداشت نہیں کر سکے گی کہ یہ نظام دُنیا کے کسی خطے میں بھی قائم ہو جائے۔چنانچہ کلامِ اقبال میں اقوامِ مغرب اور تہذیبِ مغرب کے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے (اور اس تکرار و اصرار کے ساتھ کہا گیا ہے) اس سے مقصود قرآنی مسلمانوں کو متنبہ (Warn) کرنا تھا کہ تمہاری اس اسکیم کی مخالفت تمام دُنیا کی طرف سے ہوگی۔

قائداعظمؒ:

اقبالؒ یہ کہتے ہوئے دُنیا سے چلے گئے تو اس کے بعد قائداعظمؒ اس پکار کو لے کر آگے بڑھے۔سب سے پہلے انہوں نے یہ بتایا کہ اس مملکت میں اندازِ حکومت کس قسم کا ہوگا۔فرمایا کہ یہ اسلامی مملکت ہوگی اور اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور

اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(انٹرویو حیدرآباد، دکن، شائع شدہ روزنامہ انقلاب، لاہور، مورخہ 8 جنوری 1942ء)

انہوں نے بھی اقبالؒ کے تتبع میں اس امر کی وضاحت کردی کہ اس مملکت میں مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں ہوگا۔ انہوں نے 1938ء میں مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے، نوجوانوں سے کہا تھا کہ:

''مسلم لیگ نے (کم ازکم) ایک کام تو کر دیا ہے اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے۔۔۔ اس نے تمہیں اس ناخوش آئند طبقہ کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرا دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔'' (تقاریر، جلد اوّل، ص:48)

انہوں نے مسلم لیگ کنونشن منعقدہ دہلی (11 اپریل 1946ء) میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:

''اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے یاد رکھئے! ہمارا نصب العین تھیا کریسی نہیں۔ ہم تھیا کریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔'' (طلوعِ اسلام، ستمبر 1972ء)

انہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد فروری 1948ء میں بہ حیثیت گورنر جنرل اہل امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا تھا کہ:

تھیا کریسی نہیں ہوگی:

پاکستان میں کسی قسم کی تھیا کریسی نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ چونکہ ہمارے ہاں ابھی تک نہ تو تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب ہوئی ہے اور نہ ہی قائداعظم کی کوئی معیاری سوانح حیات، اس لئے یہ چیز قوم کے سامنے آئی ہی نہیں کہ تحریکِ پاکستان میں متصادم محاذ کون کون سے تھے اور ان میں وجہِ نزاع اور بناءِ مخالفت کیا تھی۔ یہ متصادم محاذ تھے مذہبی پیشوا اور اقبالؒ اور قائداعظمؒ اور بناء مخاصمت تھی اسلام کا وہ تصور جسے علماء پیش کرتے تھے اور اس کے برعکس وہ تصور جو اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے پیش نظر تھا۔ یہ جنگ تھی درحقیقت اسلام کے دو تصورات کے درمیان ـــــ ایک وہ اسلام جو کتاب اللہ پر مبنی تھا۔ دوسرا وہ اسلام جو ہمارے دور ملوکیت کا وضع کردہ تھا اور جس کے علمبردار ہمارے علماء تھے، اور ان کے ہم نوا وہاں کے ہندو، ہندو اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر قرآنی نظام ان کی دیوار بہ دیوار مملکت (پاکستان) میں قائم ہو گیا تو اس کے انسانیت ساز نتائج کو دیکھ کر وہاں کی (مسلم اور غیر مسلم) آبادی حکومت کو چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔ اس لئے وہ بھی اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ مملکت پاکستان میں اقبالؒ اور جناحؒ کے تصور کا اسلام کارفرما ہو جائے۔ آپ دیکھئے کہ وہاں یہ ہر دو تصورات کس طرح ایک دوسرے سے متصادم تھے۔ (چونکہ اس جنگ کی ابتداء ہندوستان کی سرزمین سے ہوئی تھی اس لئے ہم اس کا آغاز وہیں سے کرتے ہیں۔ آگے چل

کر ہم دیکھیں گے کہ اقوامِ مغرب نے اس جنگ میں کیا رول ادا کیا ہے اور ابھی تک کر رہی ہیں)۔

علماء کا اسلام:

ہندوستان میں علماء کا مسلک یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کو شخصی قوانین۔ نکاح، طلاق وغیرہ کی آزادی ہو، تو حکومت خواہ سیکولر ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے اسلام کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ (ان علماء کے سرخیل) مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کا ارشاد تھا کہ:

''ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہئے۔ ایسی مشترکہ آزادی، اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے۔'' (زمزم، 7 جولائی 1938ء)

اس اسلام کے تحفظ کی ضمانت ہندو دیتا تھا۔ مولانا مذکور کے ارشاد کے مطابق:

''کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ لگے۔ (مولانا مدنی کا پمفلٹ، متحدہ قومیت اور اسلام، ص: 61) جسے انہوں نے علامہ اقبالؒ کے جواب میں شائع کیا تھا۔)''

یہ تھا اسلام کا وہ تصور جسے علماء کرام پیش کرتے تھے اور جس کے تحفظ کی ضمانت ہندو دیتا تھا۔ اس کے برعکس داعیان پاکستان کے پیش کردہ اسلام کا تصور یہ تھا کہ اسلام کو اسی صورت میں آزاد تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ اس کا نفاذ مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت میں ہو۔ اسلام میں مملکت کی بنیاد ہی دین پر استوار ہوتی ہے۔ اس تصور کے اسلام کے متعلق ہندو کا ردعمل کیا تھا۔ اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اوائل 1938ء میں جب مملکت پاکستان کا مقصود و مطلوب اُبھر کر سامنے آ گیا تھا، کانگریس کے (اُس زمانے کے) مشہور لیڈر، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے ایوان اسمبلی میں جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے، قائداعظمؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

''اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو اُن کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصر حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی، اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔'' (ہندوستان ٹائمز، 5 ستمبر 1938ء)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا کہ:

''حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعلِ عبث ہو گا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں

اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں، یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔'' (ہندوستان ٹائمز 14 نومبر 1939ء)

اور خود مسٹر گاندھی نے کہا:

''اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے۔۔۔ مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔'' (ہریجن، 9 دسمبر 1946ء)

جب مارچ 1940ء میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی، تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، مسٹر گاندھی نے کہا تھا:

''میں پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناحؒ اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آج کل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں، ان میں پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔'' (ہندوستان ٹائمز، 7 اپریل 1947ء)

اس کے دو ہی ماہ بعد مسٹر گاندھی نے پھر کہا کہ:

''اگر مذہب کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے۔ یعنی ایک نجی کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترکہ عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہِ عمل بھی مشترک ہو۔'' (ہندوستان ٹائمز، 9 جون 1940ء)

یکم نومبر 1941ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور رہنما مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

''تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سُن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنا لیں جہاں طرز حکومت، قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اُردُو اُن کی قومی زبان بن سکے، مختصر یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔'' (ٹریبون، 6 نومبر 1941ء)

یہ کچھ ہندوؤں نے تحریکِ پاکستان کے دوران کہا۔ تقسیم ہند کے بعد بھی یہ شعلہ ان کے سینے میں برابر بھڑکتا رہا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہوجائے گی۔ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد وہاں کے مشہور اخبار ہندوستان ٹائمز نے اپنی 19 اکتوبر 1948ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا تھا:

''پاکستان، بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے رہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔''

اس کے بعد اس نے (اسی مقالۂ افتتاحیہ میں) کہا کہ:

''اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریق سے طے ہوجائے اور پاکستان اسلامی اسٹیٹ کے خیال کو ترک کردے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوش گوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہوجائے گا۔''

اکتوبر 1948ء میں لیاقت علی خان (مرحوم) نے لندن میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے اور ہم نے تہیہ کرلیا ہے کہ وہ ان اصولوں پر قائم کی جائے گی جو ہمیں اسلام نے سکھائے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز 25 اکتوبر 1948ء)

اس پر اسی اخبار نے اپنی 28 اکتوبر کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا کہ:

''تقسیم ہند کے وقت سے ہندوستان کے نیتاؤں نے اس امر کا اعلان کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں سیکولر حکومت ہوگی لیکن سرحد کے اس پار کے لیڈر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اسلامی اسٹیٹ ہوگا۔۔۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مسٹر لیاقت علی خان نے کہا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے۔''

آپ نے دیکھا کہ ہندو، اُس اسلام کے تو تحفظ کی ضمانت دیتا تھا جسے علماء پیش کرتے تھے لیکن اس اسلام کے تصور تک سے اس کے سینے پر سانپ لوٹتے تھے جس کے نفاذ کے لئے مملکت پاکستان (کا پہلے مطالبہ کیا گیا تھا اور بعد میں یہ) وجود میں آگئی تھی۔ اس قسم کی مملکت کی مخالفت میں ہندو کس حد تک جانے کی سوچ رہا تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب تقسیم ہند کا فیصلہ ہوگیا تو کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لعل نہرو ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ:

''ہماری سکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت مسٹر جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہوکر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کرلیجئے۔''

(Pakistan Faces India....P.99)

اسے پھر ذہن میں رکھئے کہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ہندو کو مسلمانوں کی ایک الگ مملکت بنانے پر کوئی خاص اعتراض'' نہیں تھا۔ انہیں اعتراض تھا تو اس پر کہ وہ مملکت (اقبال اور جناح کے تصور کے) اسلام کے نفاذ کا ذریعہ ہوگی۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ 1965ء کی جنگ میں عبرت آموز شکست کھانے کے بعد، اُس زمانے کے (ہندوستان کے) وزیر دفاع مسٹر چوّن نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ:

''پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتے بھر کی نہیں، بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کُن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔''

1971ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھارت نے بہت بڑا جشن منایا تھا اور وہاں کی پارلیمان نے اس کامیابی پر مسز گاندھی کی خدمت میں ہدیۂ مبارک باد پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں مسز گاندھی نے جو کچھ کہا تھا وہ ہندو ذہنیت کی پوری پوری غمازی کرتا ہے۔ اُس نے کہا تھا۔

''یہ کامیابی، نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے، یہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔''

(یہ مسٹر گاندھی کے بقول) باطل نظریہ کیا تھا؟ یہی کہ مملکت کی بنیاد (اقبالؒ اور جناحؒ کے تصور کے) اسلام پر رکھی جائے گی۔

مرحوم مودودی صاحب کی طرف سے مخالفت:

مطالبۂ پاکستان کی سب سے زیادہ شدید مخالفت سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کی طرف سے ہوتی تھی۔ اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں گذشتہ تیس پینتس سال میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اس کے دُھرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ (طلوعِ اسلام نے تو بلکہ 1940ء میں ان کی مخالفت کی تھی۔) ان کا اندازِ مخالفت، نیشنلسٹ علماء سے مختلف تھا لیکن اقبالؒ اور جناحؒ کے پیش کردہ اسلام کو وہ بھی ''کافرانہ'' قرار دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی مشہور تالیف مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش، حصہ سوم میں لکھا تھا:

''جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہوجائیں اور یہاں جمہوری نظام رائج ہوجائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہوجائے گی۔ اُن کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس

کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل لعنت۔''

(ص:131،132)

انہوں نے اپنی مخالفت، تقسیمِ ہند کے زمانے تک برابر جاری رکھی۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپریل 1947ء میں (جب تقسیمِ ہند کا اصولی فیصلہ ہو چکا تھا) ٹانک۔ مدراس اور پٹنہ میں اپنی جماعت کے خصوصی اجلاس منعقد کئے تاکہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو مطالبۂ پاکستان کے خلاف بھڑکایا جائے، چنانچہ انہوں نے اس وقت بھی تحریکِ پاکستان کو ''غیر اسلامی'' قرار دیا اور (ان کے ایک رفیق کار) ملک نصر اللہ خان عزیز (مرحوم) نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

''بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقامتِ دین کے آغاز سے پہلے زمین کا ایک قطعہ حاصل کر لینا ضروری ہے جہاں دین کو برپا کر سکیں۔ حیرت ہے کہ یہ چیز خاصے سمجھدار اور بظاہر معقول اور عالمِ دین لوگوں تک کی طرف سے کہی جاتی ہے۔ ایسی باتیں وہی لوگ کہہ سکتے ہیں۔ جو یا تو سیاست اور فلسفۂ اجتماع سے کلیۃً نابلد ہیں اور محض اِدھر اُدھر سے چند باتیں اور نعرے سُن سنا کر سیاسی تحریکوں میں شامل ہو گئے ہیں اور کوئی سمجھدار آدمی موجود نہ ہونے کی وجہ سے لیڈری کے درجے کو پہنچ گئے ہیں۔ یا پھر نفس پرستی میں مبتلا اور خوفِ خدا سے آزاد ہونے کی وجہ سے اَن پڑھ اور حقائق وسیاست سے ناواقف عوام کو بے وقوف بناتے ہیں تاکہ وہ ان کے چنگل سے نکلنے نہ پائیں۔ ورنہ موٹی بات ہے کہ حکومت کے قیام کے لئے آپ کو اینٹ اور گارے کی ضرورت نہیں کہ آپ قطعات زمین تاکتے پھریں۔ اس کے لئے آپ کو زمین کی نہیں بلکہ ایسی مضبوط اور منظّم جماعت کی ضرورت ہے جو آپ کے پیشِ نظر نظریہ حکومت کو ماننے اور اس کے لئے مر مٹنے والی ہو۔ اگر آپ نے ایسی جماعت پیدا کر لی تو جہاں بھی وہ ہوگی وہیں وہ اس نظریہ کی حکومت قائم کر لے گی۔ (روئداد جماعت اسلامی، حصہ پنجم، ص:65؛ ص:154)

یعنی ان کے نزدیک بھی، اسلام کے نفاذ کے لئے الگ خطۂ زمین کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی بات نیشنلسٹ علماء کہتے تھے اور ہندو بھی یہی چاہتا تھا۔

آپ نے دیکھا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران بنیادی وجۂ نزاع کیا تھی؟ یہ درحقیقت اسلام کے دو تصورات کا ٹکراؤ تھا۔ اسلام کا ایک تصور یہ تھا کہ حکومت کسی قسم کی بھی ہو اس میں اسلام پر عمل ہو سکتا ہے۔ دوسرا تصور یہ تھا کہ اس کے لئے الگ آزاد مملکت کا قیام لاینفک ہے۔ جس میں حکومت قرآنی خطوط پر متشکل ہو۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد:

ہندوؤں اور مسلمانوں کی ان مذہب پرست جماعتوں کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان کے لئے ایک قطعۂ زمین حاصل ہو گیا۔ یہ ان کی شکست تھی لیکن انہوں نے اس شکست کو فتح سے بدلنے کے لئے مختلف تدابیر سوچ لیں۔ (جیسا کہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اعلان کیا تھا) ہندو حکومت کے یہ ارادے تھے کہ سیاسی اور عسکری سطح پر ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن

سے مملکت پاکستان کا (خاکم بدہن) وجود ہی باقی نہ رہے۔ لیکن مذہب پرست جماعتوں نے یہ ارادہ کیا کہ یہ جداگانہ مملکت قائم رہتی ہے تو رہے، لیکن اس میں اقبالؔ اور جناحؔ کے تصور کا اسلام نافذ نہ ہونے پائے۔ اسلام وہی نافذ ہو جس کے علمبردار علماء حضرات ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ یہ تمام جماعتیں پاکستان آجائیں اور یہاں اپنے تصور کے نفاذ کی کوشش کریں۔ چنانچہ تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی یہ سب ہجوم کر کے اِدھر آ گئے۔ ہندوستان سے پاکستان کی طرف آنے والے مسلمان عوام بیچارے تو لاکھوں کی تعداد میں قتل ہو گئے۔ ان کے قافلے لوٹے گئے۔ ان کی عصمتیں برباد ہو گئیں۔ یہ تباہ اور برباد ہو گئے۔ لیکن مذہب کے علمبردار حضرات امن وامان سے بحفاظت اِدھر منتقل ہو گئے۔

اقوامِ مغرب کی طرف سے مخالفت:

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ حقیقی اسلام کے نفاذ سے ہندو ہی لرزاں وترساں نہیں تھا۔ مغرب کی سرمایہ پرست اور سیکولر نظام کی حامی اقوام بھی اس سے خائف تھیں۔ اس لئے ان کی بھی یہی کوشش تھی کہ (اوّل تو پاکستان بنے ہی نہ، اور اگر یہ بن بھی جائے تو یہاں) اقبالؔ اور جناحؔ کے تصور کا حقیقی اسلام نافذ نہ ہونے پائے۔ اقبالؔ نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس کی نگہِ بصیرت نے اس خطرے کو بھی بھانپ لیا تھا۔ ان کی آخری تصنیف ''ارمغانِ حجاز'' میں ایک نہایت شگفتہ اور بلیغ نظم ہے جس کا عنوان ہے۔ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ اس میں انہوں نے بڑے دلکش محاکاتی (ڈرامائی) انداز میں، ان اقوام کے اس خطرہ کو بے نقاب کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کے ازالہ کے لئے انہوں نے کیا سوچا ہے۔ انداز اس نظم کا یہ ہے کہ ابلیس اپنی کابینہ کی میٹنگ منعقد کرتا ہے جس میں ہر شعبے کا مشیر اپنی اپنی کارگزاری کی رپورٹ پیش کرتا ہے کہ اس نے مختلف اقوام کو ابلیسی راستوں پر ڈالنے کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ صدرِ مجلس، ابلیس، ان رپورٹوں کو بڑی توجہ سے سنتا ہے اور آخر میں کہتا ہے کہ تم نے جن تحریکوں کو ابلیسی پروگرام کے راستے کی رکاوٹ بتایا ہے مجھے ان میں کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔ ان کے برعکس ؎

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

تم نے سب سے زیادہ زور اس پر دیا ہے کہ کمیونزم میں ہمیں بڑا خطرہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن تمہاری نگاہ حوادثِ عالم کی سطح پر ہے اور

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

جب ابلیسؔ نے کہا تھا کہ اسے درحقیقت خطرہ اُمتِ مسلمہ سے ہے تو اس کے مشیروں میں کچھ چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ اس پر اس نے کہا کہ تمہارے دل میں جو شکوک اُبھر رہے ہیں، مجھے ان کا احساس ہے۔

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں مَیں کہ مشرق کی اندھیری رات میں بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

میں یہ سب جانتا ہوں:

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

وہ شرعِ پیغمبر ﷺ۔یعنی قرآنی نظام،جس کی خصوصیات یہ ہے کہ:

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر وعمل کا انقلاب! پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ ''آئیں'' تو خوب یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

اسے اچھی طرح یادرکھو کہ تمہارے لئے کرنے کا کام ایک ہی ہے۔اوروہ یہ کہ

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات!

انہوں نے کہا کہ اس کے لئے کرنا کیا چاہئے؟ اس نے کہا کہ یہ قوم بڑی مذہب پرست واقع ہوئی ہے،اس لئے اس سے مذہب کا چھڑادینا مشکل ہے۔قرآن ان کے ہر گھر میں ہوتا ہے۔انہیں کھلے بندوں اس سے بیگانہ نہیں بنایا جاسکتا۔اس کے لئے بڑے پُرفریب حربہ کی ضرورت ہوگی،اوروہ یہ کہ ان میں نظری مسائل کی بحثیں چھیڑدو:

ہے یہی بہتر الٰہیّات میں اُلجھا رہے یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

اوراس طرح:

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے تابساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

پھر سُن رکھو کہ:

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اس خطرہ سے محفوظ و مامون رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے اوروہ یہ کہ:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس سے مراد صرف تصوف کی خانقاہیت نہیں۔وہ مذہب بھی ہے جس کی علمبردار ہماری مذہبی پیشوائیت ہے۔

علامہ اقبالؔ نے پاکستان کا تصور دینے کے ساتھ ہی اس خطرہ سے بھی آگاہ کر دیا جو اُسے پیش آنے والا تھا۔یعنی نظام سرمایہ داری کی حامل اقوام مغرب (جنہیں بغرض تعارف امریکن بلاک کہا جاتا ہے)۔کی طرف سے اس کی مخالفت۔اس بلاک کی ابلیسیت کا یہ عالم ہے کہ خود ابلیس نے بحضور رب العزت درخواست کی تھی کہ مجھے اب ریٹائر کر دیجئے، کیونکہ

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

اس بلاک کے پیش نظر دو مقصد تھے۔ایک کمیونزم کے سیلاب کی روک تھام اور دوسرے پاکستان میں اس اسلامی نظام کو قائم نہ ہونے دینا،جس کی خاطر اسے حاصل کیا گیا تھا اور جس میں اس بلاک کو اپنی موت نظر آتی تھی۔ان مقاصد کے حصول

کے لئے مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت کو اپنا آلۂ کار بنانا ضروری تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ روس کے بڑھتے ہوئے خطرہ کی روک تھام کے لئے امریکہ نے مسلمانانِ عالم کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

''دنیا کے خدا پرستو! آؤ ہم متحد ہو کر اس الحاد اور بے دینی کا مقابلہ کریں۔''

جب 1976ء میں پاکستان میں سیرت کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں یونیورسٹی آف ایڈنبرا کے شعبۂ اسلامیات کے پروفیسر ڈبلیو، منٹگمری، واٹ، بھی شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے 6 مارچ 1976ء کو اپنے خطاب کے دوران کہا تھا کہ اس وقت نوعِ انسانی اخلاقی اور ثقافتی سطح پر ایک نہایت نازک صورتِ حال سے دو چار ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے فرزندانِ توحید کی طرف سے زیادہ سے زیادہ تبلیغ میسر آسکے تا کہ عیسائی اور مسلمان اپنے مشترکہ دشمن ''الحاد'' کے خلاف مل کر جہاد کر سکیں۔

(نوائے وقت، لاہور، مورخہ 7 مارچ 1976ء)

اس ''زیادہ سے زیادہ تبلیغ'' کے لئے اس بلاک نے کیا کچھ کیا اس کے متعلق ہم آگے چل کر تفصیل سے بتائیں گے جہاں فنڈامینٹل ازم کی تحریک کا ذکر آئے گا۔ سردست آپ ''الحاد و بے دینی کے خلاف جہاد'' کو دیکھئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ الحاد اور بیدینی کی مخالفت مسلمانوں کا فریضہ ہے لیکن قرآن تو روس کے انکارِ خدا اور اقوامِ مغرب کے اقرارِ خدا دونوں کو یکساں قرار دیتا ہے، اور دونوں سے اُس خدا پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے جس کا تصور قرآن نے پیش کیا ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے اس میں فرق کیا اور روس کی لادینی کی مخالفت کو اپنا دینی فریضہ قرار دے لیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے جس قدر یہ جہاد زور پکڑتا گیا، مغربی بلاک کا نظامِ سرمایہ داری اس نسبت سے مستحکم ہوتا گیا۔ یہ اس بلاک کا پہلا مقصد تھا۔ اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ پاکستان میں اس اسلام کا نفاذ نہ ہونے پائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مذہبی جماعتوں کا تعاون ضروری تھا۔ اس سلسلہ میں (کالعدم) جماعت اسلامی کا نام نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ اس زمانے میں تو اس قسم کی خبروں کو کسی نے چنداں درخورِ اعتنا نہ سمجھا لیکن اب جو ماضی کے ان واقعات پر نگہ بازگشت ڈالتے ہیں تو نظر آجاتا ہے کہ اس جماعت کے امریکن بلاک کے ساتھ شروع ہی سے روابط قائم تھے۔ (مثلاً) روزنامہ امروز (لاہور) کی یکم دسمبر 1952ء کی اشاعت میں یہ خبر درج تھی کہ:

''امریکن سفارت خانہ کے پروفیسر ڈاکٹر ویلر نے گورنمنٹ کالج میانوالی کے طلباء کو لیکچر دیئے جن میں کمیونزم کی مخالفت تھی۔ ان کے ساتھ جماعت اسلامی، لاہور کے راہنما بھی آئے تھے اور مقامی امیر مولانا گلزار احمد تھے۔'' (بحوالہ امروز، مورخہ یکم دسمبر 1976ء)

یہ 1952ء کا ذکر ہے۔ 1955ء میں حکومت پاکستان نے امریکہ کے ساتھ اپنے روابط مستحکم کرنے کا فیصلہ کیا تو (مرحوم) مودودی صاحب نے لاہور اور کراچی میں پبلک جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے، کھلے الفاظ میں کہا:

''اگر یہ (امریکن) بلاک فی الواقعہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے مسلم بلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کونسی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ اسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصلی سرچشمہ ہوتے ہیں۔۔۔ مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آرہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو۔ (جماعت اسلامی کا ترجمان اخبار تسنیم بابت، 16 و 20 دسمبر 1955ء)

ظاہر ہے کے اس بلاک کو مسلم عوام کا تعاون ان کے نمائندوں کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتا تھا۔

ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ یہ روابط قائم ہوئے یا نہیں اور اگر قائم ہوئے تو ان کی نوعیت کیا تھی، البتہ یہاں اس قسم کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں کہ امریکہ کی طرف سے یہاں کی مذہبی جماعتوں کو مالی امداد ملتی ہے۔ حتیٰ کہ (اُس زمانہ کی) نیشنل عوامی پارٹی کے جائنٹ سیکرٹری محی الدین احمد صاحب نے ڈھاکہ کے ایک پبلک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ ''جماعت اسلامی'' کو سی۔ آئی۔ اے کی طرف سے حال ہی میں ساٹھ لاکھ روپیہ ملا ہے اور اس سے پہلے وہ غلافِ کعبہ تیار کرانے کے بہانے۔۔۔ پچیس لاکھ روپیہ ہضم کرگئی ہے۔ (بحوالہ روزنامہ امروز، مورخہ 14 مئی 1967ء)۔ اسی سلسلہ میں مؤقر جریدہ ''چٹان'' لاہور نے اپنی 15 مئی 1967ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا:

''غیر ملکی حکومت سے گفتگو کرنے اور اس کے ساتھ روابط پیدا کرنے کا حق صرف اس ملک کی حکومت کو ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک کی کوئی جماعت اپنے طور پر یہ اقدام کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کی نہیں، بلکہ کسی اور ملک کی گماشتہ ہے۔''

اسلام نافذ کرو کا نعرہ:

ہم اس سوال کے سیاسی گوشے سے قطع نظر کرتے ہوئے، اس گوشے کی طرف آتے ہیں کہ جن مذہبی جماعتوں نے مطالبۂ پاکستان کی اس قدر مخالفت کی تھی انہوں نے یہاں ''اسلام نافذ کرنے'' کے سلسلہ میں کیا کیا۔ انہوں نے یہاں آتے ہی یہ مطالبہ شروع کردیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اس لئے یہاں سب سے پہلا کام اسلام کے نفاذ کا ہونا چاہئے۔ اور یہ کام ہم ہی سرانجام دے سکتے ہیں۔ ان سے کسی نے نہ پوچھا کہ آپ یہاں کون سا اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں؟ وہ اسلام جس کا تصور اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے پیش کیا تھا، یا وہ اسلام جسے آپ پیش کرتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ انہوں نے وہی اسلام نافذ کرنا تھا، جسے یہ وہاں پیش کرتے تھے اور جس سے پاکستان کی جداگانہ مملکت کا جواز ہی باقی نہیں رہتا تھا۔ انہوں

نے جب اپنے مطالبہ پر زیادہ زور دیا تو اعتراض یہ ہوا کہ آپ میں تو اس قدر فرقے ہیں جن میں اس قدر باہمی اختلاف ہے، اس لئے یہاں کون سا اسلام نافذ کیا جائے! اگر آپ کوئی متفق علیہ فارمولا متعین کر سکیں تو اس باب میں پیش رفت ہو سکے۔ اس اعتراض کے جواب میں انہوں نے 1951ء میں مختلف فرقوں کے نمائندگان پر مشتمل (31) علماء کی کانفرنس منعقد کی جس میں قانون سازی کے سلسلہ میں حسب ذیل فارمولا پیش کیا گیا:

(1) پرسنل لاز، ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں گے۔ اور

(2) ملک کے قوانین کتاب وسنت کے مطابق مرتب کئے جائیں گے۔

یہ بہت بڑا مقدس فریب تھا جو قوم کو دیا گیا۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ ملکی قوانین کا کوئی ضابطہ مرتب ہو ہی نہ سکے۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی معنی خیز ہے۔ جہاں تک ''کتاب'' کا تعلق ہے، اس سے مراد قرآن مجید ہے جو سب فرقوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ لیکن سنت کی یہ کیفیت نہیں۔ یہی نہیں کہ ہر فرقہ کی سنت الگ الگ ہے۔ سنت کہتے کسے ہیں، اس میں بھی ان کا اختلاف ہے اور شدید اختلاف کانفرنس میں پاس کردہ فارمولا (کتاب وسنت) پر دستخط کرنے والوں میں، سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اور مولانا محمد اسماعیل سلفی (مرحوم) صدر مرکزی جماعت اہل حدیث، سرفہرست تھے۔ سنت کی (Definition) کے متعلق ان میں جو بحث چلی، وہ مولانا مرحوم کی طرف سے شائع کردہ کتاب ''جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث'' میں بالتفصیل درج ہے۔ اس کے نمایاں اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ اہل حدیث حضرات کے نزدیک جس کے نمائندہ مولانا سلفی (مرحوم) تھے۔ صحیح احادیث میں جو کچھ آیا ہے، وہ سب کا سب سنت ہے۔ اس کے برعکس مودودی صاحب (مرحوم) کے نزدیک:

مودودی صاحب کے نزدیک سنت:

''سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں۔ جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی ﷺ نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق اور امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جزو سنت ہے اور کونسا جزو عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔۔۔ تمدن ومعاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی ﷺ تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی ﷺ نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضور ﷺ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ ﷺ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپ ﷺ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اقوام اور تمام لوگوں کے

لئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔'' (رسائل ومسائل، حصہ اوّل، ص:311، 317)

اسی کتاب میں وہ ص:314 پر لکھتے ہیں:

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضور ﷺ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرز معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبی ﷺ پہنتے تھے اور نہ شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم ورواج کو دُنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں، سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے دینا منجملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظام دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

یعنی اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک صحیح حدیث میں جو کچھ آیا ہے وہ سب کا سب سنت رسول اللہ ﷺ کے دائرے میں شامل ہے اور اس سے انکار کرنا کفر ہے۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک صحیح احادیث میں سے وہ باتیں سنت کے دائرے میں داخل نہیں جنہیں نبی اکرم ﷺ نے اپنی بشری حیثیت سے عادتاً اختیار کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنت قرار دے تو اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد تھا کہ:

> میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً، ص:308)

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں:

> ''جو امور آپ ﷺ نے عادتاً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کر لیں، اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا ہرگز یہ منشاء نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔''
> (ایضاص:300)

اس پر اعتراض یہ وارد ہوا کہ احادیث کے مجموعوں میں تو اس کی تصریح کہیں درج نہیں کہ حضور ﷺ نے فلاں بات بہ حیثیت رسول ﷺ فرمائی (یا کی) تھی اور فلاں بات بشری حیثیت سے۔ تو (مودودی صاحب کے اصول کے مطابق) سنت کو متعین کیسے کیا جائے گا۔ اسے کون متعین کرے گا اور اس کے سنت ہونے کی سند کیا ہوگی؟ اس کے جواب میں مودودی (مرحوم) نے کہا کہ ایسے معاملات کا فیصلہ سند اور دلیل کی رُو سے نہیں ہوا کرتا۔ اس کا فیصلہ وہ شخص کر سکتا ہے:

> جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرت مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ ﷺ کا مزاج شناس

ہوجاتا ہے۔۔۔اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پُرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جوہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔۔۔اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السنہ مقبول حدیث سے بھی اعراض کرجاتا ہے۔اس لئے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے، وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی ﷺ کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات، حصہ اوّل، ص:302، ص:324)

مولانا اسماعیل (مرحوم) نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول ﷺ کا مزاج شناس تصور کرلے۔ پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرلے جسے چاہے رد کردے، یا کوئی عالم یا قائد بلاوجہ کسی موضوع یا مختلق، مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعویٰ کردے کہ میں نے اس میں ''ہیرے کی جوت'' دیکھ لی ہے۔تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم ان شاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسول ﷺ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ (جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث، ص:63)

ظاہر ہے کہ جب سنت کی (Definition) میں اختلاف کا یہ عالم ہے۔تو سنت کا وہ مجموعہ کہاں سے مل سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر سنت تسلیم کرتے ہوں۔ان حالات میں آپ خود فیصلہ کرلیجئے کہ 1951ء میں (31) علماء نے جو متفق علیہ مطالبہ پیش کیا تھا (کہ ملکی قوانین کتاب وسنت کے مطابق مرتب ہوں) وہ کہاں تک قابل عمل تھا؟ اس کے باوجود، یہ حضرات (مودودی مرحوم سمیت) بیس سال تک یہ مطالبہ پیش کرتے رہے کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کتاب وسنت کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں۔تا آنکہ 1970ء میں خود مودودی مرحوم کو اعلان کرنا پڑا:

کتاب وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاز کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (جماعت اسلامی کا ترجمان، ایشیاء، 23 اگست 1970ء)

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ خیال اُبھرا ہوگا کہ جب مودودی (مرحوم) نے محسوس کیا کہ یہ سنت کے پیدا کردہ اختلافات ہیں جن کی وجہ سے ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا، تو انہوں نے تجویز کیا ہوگا کہ قانون سازی کا مدار قرآن کو قرار دے دیا جائے۔ کیونکہ اس میں تو کسی کو اختلاف نہیں، لیکن توبہ کیجئے، وہ ایسا کس طرح کرسکتے تھے؟ قرآن کے تو نام سے ان حضرات کو چڑ ہے کیونکہ اس سے ان کا رچایا ہوا سارا کھیل ختم ہوجاتا ہے۔ان لوگوں کو قرآن کے نام سے کس

قدر چڑ ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ دو سال اُدھر کی بات ہے، سعودی عرب نے اپنے ہاں ایک نیا دستور رائج کرنے کا فیصلہ کیا اس کے مسودہ پر تبصرہ کرتے ہوئے، جماعت اسلامی کے ترجمان ایشیاء نے اپنی 13 اپریل 1980ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا:

''ایک اور بات کی جانب بھی ہم توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔۔۔خبر ہے کہ شہزادہ نائف نے کہا ہے کہ سعودی عرب کا آئین قرآنِ کریم ہوگا۔ بلاشبہ اس سے ان کا تصورِ قرآن، حدیث سے منقطع نہیں ہے۔لیکن زیادہ مناسب ہوگا کہ سعودی عرب کا جو بھی دستور بنے اس میں کتاب کے ساتھ سنت کا لفظ ضرور موجود ہو۔''

مقصد اس سے یہی تھا کہ اسلامی مملکت کی جس اسکیم کو ہم یہاں ناکام بنا چکے ہیں۔وہ کہیں سعودی عرب میں کامیاب نہ ہو جائے۔

بہرحال جب مودودی (مرحوم) نے کہا کہ کتاب وسنت کی رُو سے کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا تو ان سے پوچھا گیا کہ پھر پاکستان میں اسلامی قوانین کے سلسلہ میں کیا کیا جائے۔انہوں نے کہا کہ یہاں فقہ حنفی رائج کردی جائے۔یعنی وہ فقہ جس کے متعلق ان کے اپنے نظریات یہ تھے:

1۔مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو، زمان ومکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہوسکتا۔نہ اُس کی نظر تمام ازمنہ واحوال پر وسیع ہوسکتی ہے۔لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں میں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات، حصہ دوم، ایڈیشن 1951ء، ص:426)

2۔یہ سلف کون سے انبیاء تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے۔(ایضاً)

3۔بزرگانِ سلف کے اجتہادات نہ تو اٹل قانون قرار دیئے جاسکتے ہیں اور نہ سب کے سب دریا برد کردینے کے لائق ہیں۔صحیح اور معتدل مسلک یہی ہے کہ ان میں ردوبدل کیا جاسکتا ہے۔

(رسائل ومسائل، جلد دوم، ایڈیشن، ستمبر 1964ء، ص:282)

4۔دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن، محرم 1360ھ)

5۔میرا طریقہ یہ ہے کہ میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔اور جب میرا ان کے بیانات سے اطمینان نہیں ہوتا تو خود غور وفکر کرکے رائے قائم کرتا ہوں۔

6۔میں نہ مسلکِ اہلِ حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اور نہ حنفیت یا شافعیت ہی کا پابند ہوں۔ (رسائل ومسائل، حصہ اوّل، ستمبر 1951ء، ایڈیشن، ص:235)

7۔میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ، بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔

(ایضاً، ص:244)

8۔ایک صاحبِ عقل انسان کے لئے اس سے زیادہ شرمناک بات کیا ہوسکتی ہے کہ وہ کسی عقیدہ کا معتقد ہو اور اس اعتقاد کے حق میں اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی دلیل نہ ہو کہ اس کے باپ دادا بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے۔۔۔کسی چیز کے صحیح یا برحق ہونے کے لئے یہ کوئی دلیل ہی نہیں کہ بزرگوں سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ (تنقیحات، پانچواں ایڈیشن،ص:150،151)

9۔انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔ (ایضاً،ص:130)

فقہ کے متعلق مودودی صاحب مرحوم کے ان نظریات کے ساتھ اُن کے اس مطالبہ کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔

فقہ حنفی کو حنفی (سُنی) فرقہ کے سوا کوئی فرقہ بھی من وعن اسلامی تسلیم نہیں کرتا۔مذہب سے عدم دلچسپی کی انتہا ہے کہ جب مودودی مرحوم نے یہ تجویز کیا کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے تو کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ آپ نے کتاب وسنت کے فارمولا کو اس لئے مسترد قرار دے دیا تھا کہ اس کی رُو سے کوئی ضابطہ قوانین ایسا مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں، تو جو ضابطۂ قوانین فقہ حنفی کے مطابق مرتب ہوگا، کیا اُسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں گے؟ کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا، حتیٰ کہ ان مذہبی فرقوں نے بھی، جو چھوٹے چھوٹے (فروعی) مسائل کے اختلاف پر حنفیوں سے اُلجھتے رہتے ہیں اور ان کے اختلافی جھگڑے پولیس اور عدالتوں تک پہنچ جاتے ہیں۔اور تعجب بالائے تعجب یہ کہ خود حکومت نے بھی اس سوال کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور فقہ حنفی کو قانون سازی کا مدار تسلیم کر لیا، اس بے اعتنائی کا نتیجہ جلد ہی سامنے آ گیا۔جب زکوٰۃ سے متعلق قانون پبلک لاء کی حیثیت سے نافذ کیا گیا تو شیعہ حضرات کی طرف سے اس کے خلاف ایسا شدید عملی احتجاج ہوا کہ حکومت کو یہ قانون بدلنا پڑا اور ہر فرقہ کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کرے۔(قرآنی فقہ کے مطابق عمل کرنے کی البتہ اجازت نہیں دی گئی) یہ حشر ہوا پہلے ہی پبلک لاء کا۔جہاں تک سزاؤں (حدود) سے متعلق نافذ کردہ قوانین کا تعلق ہے خود صدرِ مملکت نے ایک سے زیادہ بار اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ ناممکن العمل ہیں۔حدود آرڈیننس کے نفاذ کے چند ہی روز بعد صدرِ مملکت (ضیاء الحق) نے امریکہ کی (C.B.S) کی ٹی وی ٹیم کو ایک انٹرویو دیا تھا جس میں (ان کے اس اعتراض کے جواب میں کہ یہ سزائیں بڑی وحشت ناک ہیں) کہا تھا کہ:

یہ ٹھیک ہے لیکن میں اس کی وضاحت اس طرح کروں گا۔اسلام سزا کے بجائے تخویف پر زور دیتا ہے۔اگر آپ اس فلسفہ پر نگاہ رکھیں گے جو ان سنگین سزاؤں کے پیچھے کارفرما ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اُس قانونِ شہادت کی رُو سے جس کا نفاذ کیا جا رہا ہے، ایک فی ہزار مجرموں کو بھی سزائیں نہیں دی جا سکیں گی۔

(پاکستان ٹائمز، 19 فروری 1979ء)

صدرِ مملکت نے، اواخر نومبر 1981ء میں، ہانگ کانگ سے شائع ہونے والے میگزین ایشیاء ویک (Asia week) کو انٹرویو دیا جس میں انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ پاکستان میں شرعی حدود کے متعلق قوانین تو نافذ کر دیئے گئے ہیں لیکن ان کے مطابق کسی کو سزا نہیں مل رہی۔ فرمایا کہ:

یہ ٹھیک ہے۔ ایسا نہیں کیا جاتا۔ آپ لوگوں کو سنگسار نہیں کر سکتے۔ قرآنی قانون کا فلسفہ یہ ہے کہ تمہارے ہاں ایسی قوت ہونی چاہئے جو لوگوں کو ارتکابِ جرم سے باز رکھ سکے۔ ذرا سوچو کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے چار گواہ مل سکیں جو شہادت دیں کہ انہوں نے جنسی اختلاط کے وقت عمل دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟ ایسا ناممکن (Impossible) ہے۔ (ایشیاء ویک، بابت 4 دسمبر 1981ء)

آپ نے غور فرمایا کہ یہاں اسلام کو کس طرح ایک عضو معطل بنا کر رکھ دیا گیا ہے؟ اس کے باوجود چرچا کیا جا رہا ہے کہ پاکستان میں اسلام کا احیاء ہو رہا ہے۔ پاکستان کے مخالفین (اور اقبالؔ کی نگہ دوررس کے مطابق) اقوامِ مغرب دونوں کا یہی منشاء تھا۔

نظامِ سرمایہ داری:

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مغرب کی نظامِ سرمایہ داری کی علمبردار قوتوں نے ''خدا پرستوں'' (یعنی مسلم اقوام) کو جو دعوتِ اتحاد و تعاون دی تھی تو اس سے کمیونزم کے سیلاب کے سامنے بند باندھنا مقصود تھا۔ مودودی مرحوم نے اسی لئے ان سے کہا تھا کہ تمہارا یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ تم مسلم ممالک کے حکمرانوں کے بجائے یہاں کے عوام سے رابطہ قائم کرو۔ یہ رابطہ کس طرح قائم ہو اس کی تفصیل میں جانے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ لیکن مودودی (مرحوم) نے اسلام کا جو معاشی نظام پیش کیا وہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ انہوں نے نظامِ سرمایہ داری کو عین مطابق اسلام ثابت کرنے کے لئے کس قدر کوشش کی۔ اس نظام کو انہوں نے اپنی کتاب ''مسئلہ ملکیتِ زمین'' میں تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس کے دو ایک اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔ وہ اس میں لکھتے ہیں:

''اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہیں۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔''

(مسئلہ ملکیتِ زمین، پہلا ایڈیشن، 1950ء، ص: 52، 53)

آگے چل کر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم

کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر دینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو۔ جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو اور جس طرح اس نے دُنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے ہو جس کو تم اُجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اُجرت یا شراکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں۔ مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں، وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔''

(ایضاً، ص:72، 73)

یہی نظام اس وقت یہاں رائج ہے جسے اسلامی کہنے کے لئے فقہ کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ دولت کا انبار در انبار جمع کرنا عین مطابقِ اسلام ہے بشرطیکہ اس میں سے چند پیسے بطور ''زکوٰۃ'' ادا کر دیئے جائیں۔ ربوٰ کا نام (جسے قرآن نے ''خدا اور رسول'' کے خلاف بغاوت قرار دیا ہے)۔ منافع رکھ دیا گیا ہے، خواہ وہ بینکوں میں جمع کردہ رقوم پر ہو، اور خواہ کاروبار میں (Sleeping Partner) کے طور پر جس کے لئے فقہ کی اصطلاح مضاربت اختیار کر لی گئی ہے۔ زمین پر بے حد و نہایت ملکیت جائز ہے بشرطیکہ اس سے ''عُشر'' ادا کر دیا جائے۔ اس قسم کے منافع کو مزارعت کہہ دیا گیا ہے۔ یہ نظام سرمایہ داری کی وہ شدید شکل ہے جس میں اب خود نظامِ سرمایہ داری کی حامل اقوامِ مغرب بھی لچک پیدا کرتی جا رہی ہیں۔ یہاں اسے اسلام کے معاشی نظام کے نام سے رائج اور مستحکم کیا جا رہا ہے۔ یہی اقوامِ مغرب کا منشاء تھا۔

فنڈامینٹل ازم:

ہندو، ہماری مذہبی پیشوائیت اور اقوامِ مغرب کی یہ تثلیثی سازش آہستہ آہستہ زمیں گیر ہوتی چلی گئی۔ لیکن اس کی رفتار

بڑی سُست تھی اور اقوامِ مغرب یہ خطرہ محسوس کر رہی تھیں کہ ان کی یہ آہستہ خرامی رفتہ رفتہ جمود کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ اس خطرہ کے ازالہ کے لئے انہوں نے ایک نئی ترکیب سوچی۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے عہدِ ملوکیت میں وضع شدہ ''اسلام'' کی شراب کہن کو نئی بوتلوں میں اس طرح بند کیا جائے کہ اصلی اور نقلی میں فرق نہ کیا جا سکے۔ اس نئی تحریک کا نام انہوں نے (Funda Mentalism) رکھا جس کے لغوی معنی ''بنیادی اسلام'' کے ہیں۔ اس تحریک کو انہوں نے اس قدر عام کیا ہے کہ مسلم ممالک میں ہی نہیں، یورپ، امریکہ، کینیڈا تک میں ہر جگہ اس کی شاخیں قائم کر دی گئی ہیں، اور وہاں کے نامور مذہبی پیشوا اور قدامت پسند پیشہ وران کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے روپے کے سیلاب کے بند اس طرح کھول دیئے ہیں کہ سب اس میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ جس اسلام کو یہ لوگ پیش کر رہے ہیں وہی ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا لیکن اس کے لئے اسلوبِ بیان ماڈرن اختیار کیا جاتا ہے۔ اس سے ''ہمارا وہ طبقہ جو مولویوں سے متنفر تھا ان کی باتیں کان لگا کر سنتا ہے، حالانکہ ان کی باتیں بھی وہی ہوتی ہیں جنہیں مولوی صاحبان پیش کرتے تھے۔ اس طرح یہ تحریک روپے کے زور اور پراپیگنڈہ کے شور سے کامیاب ہو رہی ہے۔ خواص کی نگاہوں میں ''ماڈرن ازم'' کی چمک سے اس قدر خیرگی پیدا کی جا رہی ہے کہ ان میں حقیقت اور فریب میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رہی، اور عوام کے لئے مذہب کی رسمی تقریبات کو اس قدر پُرکشش، بارونق اور مقدس بنایا جا رہا ہے کہ وہ سامریت کے اس دامِ ہمرنگِ زمین سے نکل ہی نہیں سکتے۔

یہی تھا وہ نظام جس کی محکمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں ''شعبۂ اسلام'' کے مشیر نے کہا تھا کہ ؎

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں غلام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!
یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا؟
کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام!

(ارمغانِ حجاز، ص:215،216)

اور اس میں تحریکِ پاکستان کے مخالفین اور اقوامِ مغرب واقعی کامیاب ہیں۔

پاکستان کا مقصد:

یاد رکھئے! جس مملکت کے قیام کا تصور اقبالؒ نے دیا تھا اور جس کے لئے قائداعظمؒ کی سعیِ پیہم کے تصدق ایک خطۂ زمین حاصل ہوا تھا، اسے اپنی مقصدیت کے اعتبار سے اسلامی مملکت بننا تھا۔ وہ مقصدیت یہ تھی کہ اس میں:

1۔ حقِ حکومت کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو حاصل نہیں ہوگا۔ حکمرانی صرف کتابِ اللہ (قرآن) کی ہوگی۔

2۔ اس میں غلط اور صحیح، جائز اور ناجائز، اسلامی اور غیر اسلامی کی سند اور اتھارٹی قرآن مجید ہوگا۔

3۔ اس میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن۔ خوف ہوگا تو صرف قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے مضرت

رساں نتائج کا جن کا اطلاق ہر ایک پر یکساں ہوگا۔

4۔اس میں نہ کوئی فرد رات کو بھوکا سو سکے گا۔نہ کسی کی کوئی ضرورت رُکی رہے گی۔

5۔اس میں امیر اور غریب، محتاج وغنی، حاکم ومحکوم کی تمیز نہیں ہوگی۔تمام انسان یکساں واجب التکریم ہوں گے اور تذلیل وتوہینِ آدمیت سنگین ترین جرم ہوگا۔

6۔اس میں وہ نظامِ سرمایہ داری باقی رہے گا، نہ مذہبی پیشوائیت کا وجود۔اُمت کے باہمی مشورہ سے نظامِ حکومت قائم ہوگا اور وہ نظام قرآن مجید میں متعین کردہ غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قواعد و ضوابط خود مرتب کرے گا۔انہی کو احکامِ شریعت کہا جائے گا۔

7۔اس میں ساری اُمت، اُمتِ واحدہ ہوگی جس میں کسی قسم کا تفرقہ نہیں ہوگا۔

یہ تھا وہ نظام جسے قائم کرنے کے لئے پاکستان کا خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔اس کے مخالفین کی انتہائی کوشش تھی کہ اوّل تو یہ خطۂ زمین ہی حاصل نہ ہو، اور اگر حاصل ہو بھی جائے تو اس میں یہ نظام قائم نہ ہو سکے (جسے الدین کہا جاتا ہے)۔اس کے بجائے اس مذہب کا دور دورہ ہو جس سے انسان نہ دین کا رہتا ہے، نہ دُنیا کا، اقبالؒ کے الفاظ میں ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ؎

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ وخدا مست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

قائداعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کے دوران کہا تھا:

''ہماری حفاظت، ہماری نجات اور عزت وآبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے۔اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تو تباہ ہو ہی جائیں گے لیکن اس کے ساتھ ہی اس برصغیر میں نہ مسلمانوں کا وجود باقی رہے گا۔نہ اسلام کا نام ونشان۔'' (تقاریر، جلد دوم، ص:255)

اگر قائداعظمؒ زندہ ہوتے تو وہ دیکھتے کہ پاکستان مل جانے کے بعد بھی اس اسلام پر کیا بیت رہی ہے جس کے احیاء کے لئے انہوں نے پاکستان لے کر دیا تھا۔

بہرحال، ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہم اس میں ناکام رہ گئے اور پاکستان کے مخالفین کامیاب ہو گئے۔یہ بدقسمتی ہماری ہی نہیں۔پوری کی پوری انسانیت کی بدقسمتی ہے کیونکہ پاکستان نے اس نظام کی تجربہ گاہ بننا تھا جس سے نوعِ انسان نے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا تھا۔اس اعتبار سے ہم اپنی بدنصیبی کے بھی ذمہ دار اور مجرم ہیں اور عالمگیر انسانیت کی بدنصیبی کے بھی ذمہ دار اور مجرم، ہزار سال کے بعد یہ نادرِ روزگار موقعہ ہمیں میسر آیا تھا ہم نے اسے بُری طرح کھو دیا۔اے وائے ما!اے وائے ما!!

جبیں را پیشِ غیر اللہ سودیم — چو گبراں در حضورِ او سرودیم
ننالم از کسے، می نالم از خویش — کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم

(ارمغانِ حجاز، ص:51)

مجھ سے اکثر تقاضا کیا جاتا ہے کہ میں اقبالؒ کے فارسی اشعار کا ترجمہ بھی پیش کر دیا کروں۔ میں ان اشعار کا ترجمہ کیا کروں؟ یہ تو اپنی لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر اپنا ماتم کرنا ہے۔ ہر چند کہ ماحول کی افسردگی طبیعت کو اس طرف آنے نہیں دیتی لیکن غالب نے اس مفہوم کو اپنے شوخ و شنگ انداز میں جس طرح ادا کیا ہے اس سے بات سمجھ میں آ جائے گی اُس نے کہا ہے:

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے!
غافل! ان مہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہئے

جن رفعتوں اور عظمتوں کا آئینہ دار وہ اسلام تھا جس کے لیے ہمیں یہ خطہ زمین عطا ہوا تھا اس اسلام کو نافذ کرنے والے انسان بھی اتنے ہی بلند اور عظیم ہونے چاہئیں تھے۔ ہمارے جیسے پست قامت ان بلندیوں تک پہنچنے کے قابل نہیں تھے، اس لیے ہم اس نعمت کبریٰ کے اہل نہیں قرار پائے۔ جو تیشۂ فرہاد اُٹھانے کی ہمت نہ رکھتا ہو، اسے جوئے شیر کیسے مل سکتی ہے؟ ہمیں اپنے اندر یہ ہمت پیدا کرنی چاہئے تھی۔ قرآن کریم نے ''اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ'' (تم سب پر غالب آ جاؤ گے) کے لئے اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْن۔ (اگر تم مومن ہوتے) کی شرط عائد کی تھی۔ ہم نے اس شرط کو پورا نہ کیا تو اس مقام تک پہنچ نہ سکے۔

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کی تاریخ دُہرائی جا رہی ہے۔ فرعون کی غلامی میں وہ ضعف و بیچارگی کی انتہا تک پہنچ گئے تو مشیتِ خداوندی نے اُن کی حالت پر رحم کھایا اور چاہا کہ انہیں تمکن فی الارض حاصل ہو جائے۔ (5-38:6)۔ اس کے لئے انہیں ایک خطہ زمین عطا کر دیا گیا۔ (قرآن کے الفاظ میں) اسے ان کے نام لکھ دیا۔ (5:21) لیکن جب وہ اس کے اہل ثابت نہ ہوئے تو تقدیر امم کے اٹل قانون کی رُو سے فیصلہ ہوا کہ: فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ (5:26)۔ جس زمین کا پٹہ ان کے نام لکھ دیا گیا تھا، اس سے انہیں محروم کر دیا اور کہہ دیا کہ وہ چالیس سال تک خانہ بدوشوں کی طرح صحرا نوردی کریں اور اپنے اندر تمکن فی الارض کی صلاحیت پیدا کریں۔ خدا کرے کہ ہمارے جرائم کی سزا ابدی محرومی نہ ہو۔ وقتی ہو اور جس طرح بنی اسرائیل کی اُس نسل کے بعد آنے والے مؤرخ نے اُسی سرزمین میں سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانیؑ کا نظارہ کیا تھا، ہمارا آنے والا مورخ بھی اُس نظام کی جنت آفرینیوں کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے جس کے لئے یہ خطۂ زمین ہمیں عطا کیا گیا تھا۔ اُس کی رحمتِ بے پایاں نے، جنت سے نکلے ہوئے آدم کو جنت کی بازیابی کا وعدہ بھی تو دلایا تھا۔ لیکن یہ جنت مفت میں نہیں مل جانی تھی۔ اس کے لئے فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ (2:38) کی شرط لازم تھی۔ اس طرح حاصل کردہ جنت کو کوئی چھین نہیں سکتا۔

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ تا جزائے عملِ تست، جناں چیزے ہست

مفہوم: وہ بہشت جو تمہیں (بھیک میں) بخشی گئی ہو، کسی کام کی نہیں۔ وہ جنت جو تمہاری جدوجہد اور محنت کے نتیجے میں وجود میں آئے، اس کی کیا بات ہے۔

ہمیں یہ خطۂ زمین ملا ہی اس لیے تھا کہ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (10:14)۔ ''ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام

کرتے ہو؟'' ہم نے جس قسم کے کام کئے اُسی قسم کا نتیجہ ہمارے سامنے آ گیا۔ یہاں تو

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

لیکن مجھے تو داستانِ بنی اسرائیل کو اپنے حال پر منطبق کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ ان کے متعلق قرآن نے بتایا ہے کہ اس کی تمکن فی الارض سے عارضی محرومی کے بعد، نئی نسل کے نوجوان (حضرت) موسیٰؑ پر ایمان لے آئے اور ان کے جوشِ کردار نے مخالفت کے ہر بند کو توڑ کر تمکن حاصل کر لیا۔ لیکن ہماری نئی نسل کو تو اس مقام پر پہنچا دیا گیا ہے جہاں وہ اسلام کے نام تک سے متنفر ہو رہی ہے۔ اس کا اگلا قدم سیکولرزم ہوگا۔ اُس وقت بھارت کا ہندو مسلمانوں کی وہ تمام جماعتیں جنہوں نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور اقوامِ مغرب اپنی اس کامیابی پر جشنِ مسرت منائیں گی کہ:

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

مفہوم: بلا سر پر آ گئی تھی لیکن شکر ہے ٹل گئی!

اس سے اُن کے دل پر کیا گزرے گی جنہوں نے اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام کا خواب دیکھا تھا، اس کی بابت مت پوچھئے۔ خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے!

لیکن اس کے باوجود، جب تک میرے دم میں دم ہے مَیں قرآن کی آواز بلند کئے جاؤں گا کہ میرے سامنے اُس کا یہ وعدہ موجود ہے جو کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا، کہ اس نظام کو دُنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہنا ہے۔ یہاں نہ سہی کہیں اور سہی۔

1۔ محفلِ ما بے مے و بے ساقی است ۔۔۔ سازِ قرآں را نوا ہا باقی است

2۔ زخمۂ ما بے اثر افتد اگر ۔۔۔ آسماں دارد ہزاراں زخمہ در

3۔ حق اگر از پیشِ ما بردارد ش ۔۔۔ پیشِ قومے دیگرے بگذاردش

4۔ ترسم از روزے کہ محرومش کنند ۔۔۔ آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

(جاوید نامہ، ص:91)

ترجمہ:

1۔ ہماری محفل شراب اور ساقی کے بغیر ہے، مگر قرآن کے ساز کے نغمے اپنی جگہ برقرار ہیں۔

2۔ اگر ہماری مضراب میں کوئی اثر نہیں رہا تو آسمان کے پاس ہزاروں اور ساز ندے موجود ہیں۔

3۔ اگر اللہ تعالیٰ اسے (قرآن کو) ہمارے سامنے سے اٹھا لے تو وہ اسے کسی اور قوم کے سامنے رکھ دے گا۔

4۔ میں اس دن سے ڈرتا ہوں کہ مسلمان کو قرآن سے محروم نہ کر دیا جائے۔ اور مولا کریم اپنے عشق کی آگ کسی اور کے دل پر نہ ڈال دے۔

قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک ضابطۂ حیات قرار دیا ہے، اس لئے اس کا نظام نہ کسی

خاص خطۂ زمین سے وابستہ ہے۔ نہ کسی خاص قوم تک محدود، اور نہ کسی خاص زمانے سے مختص۔ جو قوم جس ملک اور جس زمانے میں بھی اس کے حقائق پر علم و بصیرت اور عقل و فکر کی رُو سے غور کر کے انہیں اختیار کر لے گی وہ اس سے فیضیاب ہو جائے گی۔ مذہب پرست قومیں جو اپنی خوش فہمیوں میں مست اور توہم پرستیوں میں مطمئن رہتی ہیں ان کے حصے میں یہ سعادت نہیں آ سکے گی۔ دانش ورانِ مغرب، اپنے موجودہ نظامِ حیات سے تنگ آ کر ایک نئی دُنیا اور اس میں ایک جدید نظام کی تلاش میں ہیں۔

> ایک ایسی دنیا جس میں نہ کرۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ وہ دنیا ہوگی جس میں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے مسرت حاصل کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مُراد ساری دنیا کی واحد حکومت ہوگی۔ جو جمہوری طور پر تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔ ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی اسی قسم کی حسین دُنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یکجہتی ہو۔
>
> (Beyond the welfare state, By. Gunner Myrdal)

یہ دُنیا ایک ایسے مذہب کی رہین منت ہوگی:

> ''جو انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا۔ جو مشرق و مغرب کے تمام مذاہب کی تعلیم کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و فکر پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ اخلاق دے گا جو علومِ سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اُسی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔''
>
> (The Sane Society; by Erich Fromm)

ہم نے اس مقام پر دانش ورانِ مغرب میں سے صرف دو ایک کے خیالات پیش کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سب اپنی نیشنلزم کے ہاتھوں نالاں ہیں کہ دُنیا میں جنگوں کے لامتناہی سلسلہ کا بنیادی سبب یہی ہے۔ وہ اپنے ہاں کی جمہوریت سے تنگ آ چکے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ بھی ملوکیت ہی کا پرتو ہے۔ مغربی سرمایہ پرست قومیں اپنے معاشی نظام کو عالمگیر تباہی کا موجب قرار دیتی ہیں۔ اس کے برعکس روس اور چین کی سوشلزم بری طرح ناکام ثابت ہو رہی ہے اس حصہ لا کے بعد جب وہ الا (مثبت نظام) کے متعلق سوچیں گے تو وہ قرآن کے سوا کہیں نہیں ملے گا۔ اس طرح ؎

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے　　یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

والسلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

علامہ محمد اقبالؒ کا دوسرا خواب

میں بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے موقع دیا کہ میں اپنا ایک احساس آپ کے سامنے پیش کر سکوں، وہ چیز جو میں نے حکم الامت علامہ محمد اقبالؒ سے اخذ کی، آپ کے سامنے لاؤں۔[1]

میری پیدائش علامہ مرحوم کی وفات کے دو سال بعد کی ہے۔ اِس وقت میں عمر کے چھہترویں سال میں ہوں۔ بات یہ ہونی چاہئے تھی کہ میں کتنا عرصہ علامہؒ کے ساتھ وابستہ رہا اور کیوں یہ بات ان کے حوالہ سے کہتا ہوں۔ میں جب بچہ تھا تو اس وقت علامہؒ معاشرے میں گونج رہے تھے۔ سکول، گلیاں، چوپال اور مسجدیں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں علامہ اقبالؒ کا کلام نہ پڑھا جاتا ہو۔ مجھے اپنا بچپن یاد ہے کہ بانگِ درا اور بالِ جبریل کی نظموں کی نظمیں لوگوں کو یاد تھیں اور مجھے بھی۔ اس ماحول نے میرے ذہن کے اوپر اثر کیا تو میں نے علامہؒ کے کلام کو گہرائی سے پڑھا اور یہ میرے تعلیمی نصاب میں بھی شامل تھا تو میں اس علم کی بنیاد پر جو مجھے وہاں سے حاصل ہوا، جو یقین مجھے حاصل ہوا، اپنا وہ احساس یا اپنا وہ تجزیہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

تجزیئے کا پہلا عنصر یہ ہے کہ علامہؒ دینِ اسلام کے بارے میں بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ خصوصاً قرآنِ کریم کی یہ آیت (4:60) ان کے مدنظر تھی:

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّہُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ ؕ وَیُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّضِلَّہُمۡ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ﴿۶۰﴾... (4:60)

ترجمہ: کیا نہیں دیکھا تم نے ان لوگوں کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اس پر جو نازل کیا گیا ہے تم پر اور اس پر بھی جو نازل کیا گیا ہے تم سے پہلے (اس کے باوجود) چاہتے ہیں یہ کہ رجوع کریں معاملات کے فیصلے کے لیے ''طاغوت'' کی طرف حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ انکار کریں طاغوت کا۔ جبکہ چاہتا ہے شیطان یہی کہ لے جائے بھٹکا کر انہیں گمراہی میں بہت دور۔

---

[1] یہ خطاب اس سے قبل کم وبیش انہی الفاظ میں، اسلامک فلوسوفیکل ایسوسی ایشن پاکستان کے اجلاس مورخہ 11 نومبر 2015ء میں بمقام جم خانہ کلب لاہور اور دبستانِ اقبال کے اجلاس مورخہ 12 دسمبر 2015ء بمقام S-2 گلبرگ-II میں پیش کیا جا چکا ہے۔

اس آیۂ مبارکہ کی رو سے دعویٰ ایمان کے باوجود طاغوت کی حکومت میں اِرادتاً اور مطمئن رہنا دارالکفر میں رہنا ہے۔

اس اصول کی تائید سورۃ الانعام کی آیت :14 سے بھی ہوتی ہے:

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾ (6:14)

ترجمہ: کہہ دو! بے شک مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ بنوں میں سب سے پہلا جس نے حکم مانا اور (یہ بھی کہ) ہرگز نہ شامل ہونا تم شریک بنانے والوں میں۔

علامہ اقبالؒ کے دور کے مسلمانوں کی حالت ہمیشہ انہیں بے چین رکھتی تھی کیونکہ نام کے مؤمنین کے بارے میں سورۃ یوسف میں یہ ارشاد ہے:

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾... (12:106)

ترجمہ: اور نہیں ایمان لاتے ان میں اکثر اللہ پر مگر اس طرح کر وہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔

میں یہ فرق کر رہا ہوں دین اور مذہب کا۔ مذہب انفرادی (individual) ہوتا ہے یعنی "Me and My God" اس کے لیے پرستش کی جاتی ہے، پوجا کی جاتی ہے۔ اور دین قانون کا نام ہے۔ یہ ایک نظام میں رائج ہوتا ہے۔ اس نظام کی ایک عملی شکل ہوتی ہے جس کے مطابق معاشرے کو چلایا جاتا ہے۔ اگر کوئی طریق کار ایسا ہو جو معاشرہ میں رائج ہو یا ہو سکتا ہو اور اس کی بنیاد پر اللہ کے بتائے ہوئے اچھے نتائج نکلیں تو وہ دین کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں تین جگہ ایک بات فرمائی ہے۔ میں اس ٹاپک (Topic) کے حوالہ سے بات کر رہا ہوں، اُس پس منظر کے لیے جو تصور (Idea) میں نے آپ کو سنانا ہے، وہ یہ ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۹﴾

(48:28، 61:9، 9:33)

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے بھیجا اپنا رسول ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ اسے غالب کر دے سب ادیان پر خواہ کتنا ہی ناگوار ہو مشرکین کو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بھیجا ہدایت دے کر، اتنی سی بات نہیں ہے، آگے کہا و دین الحق اور ایک Establish ہونے والا System دے کر، ایک نظام دے کر، قانون دے کر جو معاشرہ میں رائج ہو کر اپنے صحیح نتائج دے گا۔ کیوں؟ کاہے کے لیے یہ دونوں چیزیں دیں؟ تاکہ خدا اور اس کا رسول اس دین کو، اس نظام کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔ غالب کرے تو پھر کچھ لوگوں کو تکلیف اور ناگواری تو ہوگی کیونکہ جن کے قانون کی جگہ خدا کی مرضی چلے گی، وہ لوگ جو مشرک ہیں۔ دیکھیں مشرک کہا ہے، کافر نہیں کہا، دو جگہوں پر کہا ہے کہ اگرچہ مشرک اسے ناگوار ہی کیوں نہ سمجھتے ہوں۔

میں یہ اس لیے بتا رہا ہوں کہ اگلی ساری بات سمجھ اس سے آئے گی کہ کتنے ہی لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں لیکن مشرک

کے مشرک ہی رہتے ہیں (سورہ یوسف آیت :106 پیش کی جا چکی ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے ساتھ اگر کوئی اپنے جذبات کو، اپنے خیالات کو، اپنے قانون کو، اپنے رسم ورواج کو، اپنے نفس کی خواہشات کو بنیاد بناتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کا مرتکب ہوتا ہے چاہے اپنے آپ کو مومن، مسلمان ہی کیوں نہ تصور کرے۔

یہ تو صرف دین ہے جو بتاتا ہے کہ کون شخص مومن، مسلمان ہے۔ اگر دین نہ ہو تو پھر ہم مذہب پرست ہیں۔ جو عبادات کرتے ہیں، وہ پوجا پاٹ کہلاتی ہیں۔ دین کا جز و نہیں ہوتا۔ اس پس منظر میں آج جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کو سنیں۔

پہلی بات ہے خواب کی، یہ جسے یہاں خواب کہا گیا ہے وہ ہمارے خواب نہیں کہ سوئے اور خواب دیکھ لیا۔ میں اس خواب کی بات نہیں کر رہا۔ اس کا ترجمہ ہے ''Vision''، نظارہ، آئینۂ ادراک وغیرہ۔

جس وقت علامہؒ نے ہوش سنبھالا اس وقت ساری دنیا میں پانچ بڑی ریاستوں کی حکومت تھی۔ یہ یوروپی استعمار پسند لوگ جو تھے انہوں نے ایشیاء، افریقہ، آسٹریلیا، شمالی وجنوبی امریکہ کے اکثر ممالک کو اپنے کنٹرول میں لیا ہوا تھا۔ ہندوستان جہاں علامہؒ پیدا ہوئے، وہ بھی اس وقت انگریزوں کی غلامی میں تھا، جہاں قانون دوسرے کا چل رہا تھا۔ دیکھیں جہاں قانون دوسرے کا چلے یا انسانوں کا خود ساختہ قانون چلے، وہاں دینِ حق نہیں ہوتا۔ جہاں دینِ حق نہیں ہوتا، وہاں ارادتاً اور مطمئن رہنے والے لوگ مشرک تو ہو سکتے ہیں لیکن صحیح Islamic status enjoy نہیں کر سکتے۔ یہ تھی وہ تکلیف جو علامہؒ کو بیدار رکھتی تھی۔ وہ کہتے تھے'' کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی''۔ وہ جو راتوں کو اٹھ کر سوچتے تھے، کچھ کہتے تھے قرآنِ کریم کے بارے میں، اللہ تعالیٰ کے بارے میں۔۔۔ یہ وہ فرق تھا کہ دین تو خدا کا جب کسی مملکت میں رائج ہوگا وہ تب ہی اپنے حق کے نتائج پیدا کرے گا۔

اگر دین رائج نہیں ہوگا تو وہ نج کا معاملہ ہے، انفرادی سطح ہے، Individual level ہے۔ یہ ہندو لیڈر گاندھی کا رویّہ تو ہو سکتا ہے، خدا کا حکم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ دین معاشرہ میں جب رائج ہو، خدا تعالیٰ کا کہنا رائج ہو، تو وہ دین ہوتا ہے۔ یہ تھی وہ کمی جس کے لئے وہ تڑپے:

❶ ازسہ قرن ایں امتِ خوار وزبوں زندہ بے سوز و سرورِ اندروں
❷ ساقیٔ دیرینہ را ساغر شکست بزمِ رندانِ حجازی بر شکست
❸ کعبہ آباد است از اصنامِ ما خندہ زن کفر است بر اسلامِ ما

لیکن مایوس ہونے کی بات نہیں، تم مسلمان ہو، تمہارے دل میں ایک آرزو رہنی چاہئے۔ انسان صاحبِ آرزو ہے۔ کیا تڑپ رہنی چاہئے کہ اُس دینِ حق کے لیے تمہاری کتنی کوشش ہے؟

---

❶ تین صدیوں سے یہ اُمت ذلیل وخوار ہو رہی ہے۔ سینے میں حرارت اور دل کے سرور کے بغیر زندہ ہے۔ ❷ توحید کے پرانے ساقی کا ساغر ٹوٹ چکا ہے۔ حجاز کے بے باک مجاہدین کی بزم قائم نہیں رہی ❸ اللہ کا گھر کعبہ آباد ہے لیکن وہاں توحیدِ باری تعالیٰ کے بجائے ہمارے اختراع کردہ بت پڑے ہوئے ہیں۔ بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ کافر اقوام ہمارے دین اسلام پر استہزاء کر رہے ہیں۔

مسلم اَستی سینہ را از آرزو آباد دار ہر زماں پیشِ نظر لاَ یُخْلِفُ الْمِیْعَاد دار
یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو مَیں

علامہؒ کہتے ہیں کہ جب میں اسلام کے ماضی پر ایک نظر ڈالتا ہوں تو مجھے کل کا چہرہ نظر آتا ہے، آج کا نہیں۔

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا جسے آ گئی میسر مری شوخیٔ نظارہ
چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است زندگی درپئے تعمیرِ جہانِ دِگر است
جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

آنکھ کھول کر دیکھ اگر خانۂ چشم میں دیکھنے والی آنکھ ہے کہ فرنگی جُوا باز تمہارے ہاں سے دولت چھین کر لے جا رہا ہیں۔

Wealth is going from South to North, From East to West

لیکن یہ سلب ونہب کا دور ختم ہو رہا ہے۔ حالات بدل رہے ہیں۔

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں میری نواؤں میں ہے اس کی سَحَر بے حجاب
حادثہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

اس آئینۂ ادراک کو انہوں نے Vision کہا ہے، خواب کہا ہے۔ یہ آئینۂ ادراک ہے، کوئی معمولی بات نہیں ۔

دو عالم را تواں دیدن بہ بینائے کہ من دارم کجا چشمے کہ بیندآں تماشائے کہ من دارم

علامہؒ نے اس بے تابیٔ تمنا کا اظہار یوں کیا ہے:

ازپئے قومے زِ خود نا محرمے خواستم از حق حیاتِ محکمے
درسکوتِ نیم شب بالا بُدم عالم اندر خواب ومن گریاں بُدم
جانم از صبر و سکوں محروم بود وردِ من یاحی و یاقیوم بود
آرزوئے داشتم خوں کردمش تازِ راہِ دیدہ بیروں کردمش

(ایک ایسی قوم کے بارے میں جو اپنے مقام سے آگاہ نہیں، میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ انہیں ٹھیک ٹھاک پائدار زندگی عطا فرما۔ سب لوگ سو رہے تھے اور میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میری جان صبر وسکون سے محروم تھی اور میں حی وقیوم سے دعا گو تھا۔ میری ایک آرزو تھی، وہ بیان کردی۔ کیسے بیان کردی؟ اُمڈتے آنسوؤں کے ساتھ میں نے اسے باہر نکال دیا۔)

یہ تھے وہ آنسو جو ان کی پہلے اور خصوصاً دوسرے خواب میں ظاہر ہوئے۔ یہ تھا وہ پس منظر۔ وہ کیوں یہ چاہتے تھے؟

دلِ زندہ سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر خواب میں دیکھتا ہے عالمِ نَو کی تصویر
اور جب بانگِ اذاں کرتی ہے بیدار اسے کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر
بدن اس تازہ جہاں کا ہے اسی کی کفِ خاک روح اس تازہ جہاں کی ہے اسی کی تکبیر

نیز یہ کہ ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

یہ تھی وہ کیفیت جس کے اندر انہوں نے ایک خواب دیکھا جسے ہم خواب اوّل کہتے ہیں۔ ان کو موقع ملا متحدہ اور غلام ہندوستان کے اندر 1930ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الٰہ آباد کی صدارت کا۔ آپ نے اپنے خطبۂ صدارت کا آغاز ان الفاظ سے کیا:

''آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لیے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت ہے جو انسانی نگاہ کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اسے اس کی فطری وسعتوں میں اذنِ بال کشائی دے گا۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ دین، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین قوت کا حامل ہے اور جسے اس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیرِ الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی، اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویہ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز نہ خیال فرمائیے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ کوئی نظری مسئلہ ہے۔ نہیں یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جو خود نفسِ اسلام پر بحیثیت ایک نظامِ حیات و عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں گے۔''

اس تمہید کے بعد انہوں نے، مذہب اور دین کے فرق کو ان الفاظ میں نمایاں کیا۔

''حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئتِ ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عمل خیر کو اپنے اندر جذب کر لے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رُو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح پابگل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اِس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے، بلکہ وہ ایک ایسی روحانی

ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ وہ ایک فعال مشینری کا پُرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لیے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوئی ہیں۔''

اس نظری بحث کے بعد وہ اس عملی سوال کی طرف آئے جس کے لیے یہ تمہید اٹھائی گئی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا:

''ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدّنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیاء کی گتھیاں سلجھا دے گا۔''

سچ کہا تھا اس دیدہ ور نے ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اس کا میرے آئینہ ادراک میں ہے

اُس وقت کے حالات کے مطابق اس مسئلہ کا انہوں نے عملی حل یہ بتایا کہ:

''میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔۔۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔''

انگریزی زبان میں ان کے الفاظ تھے:

"I would like to see the Punjab, North-West Frontier Province, Sind and Baluchistan amalgamated into a single State. Self-government within the British Empire, or without the British Empire, the formation of a consolidated North-West Indian Muslim State, appears to me to be the final destiny of the Muslims, at least of North-West India. "

اس مملکت کے قیام سے ہوگا کیا؟ فرمایا کہ:

''اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدّن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی رُوح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔''[1]

---

[1] علامہ اقبالؒ کا الٰہ آباد کے خطبۂ صدارت کی تفصیل طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی شائع کردہ کتاب ''اقبال اور قرآن'' جلد دوم صفحات 98 تا 101 سے حاصل کی گئی ہے۔

تو یہ تھا علامہؒ کا پہلا خواب۔ 1938ء میں وہ ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ لیکن ان کے ساتھیوں نے 1940ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس مورخہ 23 مارچ کو لاہور میں ایک قرارداد منظور کی جس کی بنا پر قائداعظم محمد علی جناحؒ کے قیادت میں قوم نے وہ مملکت حاصل کر لی جس کا تصور علامہؒ نے 1930ء میں پیش کیا تھا۔

میرا آج کا موضوع ہے:

علامہ محمد اقبالؒ کا دوسرا خواب

(An other vision of Allama Muhammad Iqbal)

علامہؒ کے دل میں ایک تڑپ تھی کہ کہیں ہم مسلمان مشرکین میں تو شمار نہیں ہو رہے۔ یہ بات انہیں بیتاب رکھتی تھی۔ عالمِ اسلام کے متعلق طرح طرح کے خیالات ان کے ذہن میں آتے تھے۔ یہ ہو جائے یا یوں ہو جائے، مثلاً ؎

ہو رہا ہے ایشیاء کا خرقۂ دیرینہ چاک — نوجواں اقوامِ نَو دولت کے ہیں پیرایہ پوش

اس حالت میں کیا کیا جائے:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر
تا خلافت کی بنا ہو دنیا میں پھر استوار — لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر
طہران ہو اگر عالمِ مشرق کا جنیوا — شاید کہ کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

وہ مسلمان سے مخاطب ہو کر کہتے تھے:

یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا — کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلمان کی — ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اقوامِ زمینِ ایشیاء کا پاسبان ہونے کی بات مدنظر رکھئے۔ یہ بات آگے آئے گی۔

وہ نوعِ انسانی کی وحدت کے قائل تھے۔ وہ اقوام کی شکل میں اس وحدت کو پارہ پارہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اسلام کی وحدتِ انسانی کی دعوت کو کامیاب دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کہا ؎

مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام — جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

انہی خیالات میں ڈوبے وہ سفرِ یوروپ پر گئے۔ سپین بھی گئے۔ وہی سپین جہاں 800 سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی تھی، خلافت نہیں۔ وہاں ایک دریا ہے ''الکبیر'' اس کے کنارے بیٹھے ہوئے مستقبل میں جھانکنے لگے:

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
کونسی وادی میں ہے، کونسی منزل میں ہے — عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

اس قسم کے خیالات ان کے دل میں موجزن رہتے تھے۔ یہی وہ پس منظر تھا جس کی بنا پر انہوں ایک اور پہلو پر کام کیا وہ اپنی آرزو کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے — جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا — رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو — لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

نہاں خانۂ لاہوت سے تعلق کی بنا پر اپنے Vision، آئینۂ ادراک میں جھانک ایک تحریک (Movement) کو دیکھا جو لاہور سے شروع ہو کر ان علاقوں کی طرف جائے گی جہاں بخارا اور سمرقند واقع ہیں۔ اور بھی شہر تھے کسی کا نام نہیں لیا، لاہور کا نام لیا۔ وہ خود یہاں موجود تھے اور اس تحریک کا آغاز کر رہے تھے اور اس کے لیے ایک ولولۂ تازہ دیا۔

یہ ولولہ کیا ہے؟ ولولہ کسی مقصد میں سرگرمی، انتہائی سنجیدگی، مستعدی، جذباتی لگن، جوش و خروش، انہماک، چاؤ اور زندہ تمنا کو کہتے ہیں۔ چونکہ کام کی نوعیت بے حد توجہ اور محنت چاہتی تھی، اس لئے اپنے کم کوش ساتھیوں سے یوں مخاطب ہیں:

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو — قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو — دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ — تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

پھر یہ بھی کہ ؎

یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا — کہ اقوامِ زمیں ایشیا کا پاسباں تو ہے

اب علامہؒ نے ہفت کشور کہا ہے۔ خیال و تصور میں ہفت کشور سوچا۔ یہ پاکستان، افغانستان، تاجکستان، ازبکستان، کرغیزستان، ترکمانستان اور قازقستان، یہ سات ریاستیں ہیں جن میں ''ستان'' مشترک ہے یہ ساری اب خودمختار ریاستیں (Independent States) ہیں۔ ہمارے ہاں بھی بلوچستان اور ایران کے ہاں بھی۔ دونوں صوبے (Provinces) ہیں، کشور (State) نہیں۔ کردستان ترکی میں، کردستان ایران میں، دونوں صوبے (Provinces) ہیں، Independent States نہیں۔ کشور Independent States کو کہتے ہیں اور اقلیم صوبے کو اس لئے کوئی اور خطہ Qualify نہیں کرتا۔ (ہندوستان ٹوٹنے کے بعد سرکاری طور پر اپنے کو بھارت کہتا ہے۔ وہ غیر مسلم ہے، اس صف میں نہیں آتا۔)

آپ نقشہ میں ان ریاستوں کو ملاحظہ فرمائیے اور ان کی بعض معلومات چارٹ میں دیکھیں۔


60°N
80°N
R U S S I A
Saratov
Samara
Omsk
Kustanay
Pavlodar
Barnaul
Ural'sk
Astana
Rubtsovsk
Inysh
Volgograd
Krasnodar
Gur'yev
Karaganda
Astrakhan
Semipaltinsk
K A Z A K H S T A N
Groznyy
Aral'sk
Balkhash
GEOKGIA
Tbdisi
CASPIAN SEA
Aral Sea
Kzyl-Orda
L.Balkhash
AZERBA-IJAN
Baku
UZBEKISTAN
Turkestan
Alma Ata
Tashauz
Bishkek
TURKMENISTAN
Bukhara
Tashkent
KIRGIZIA
Tarim
Tabriz
Ashkhabad
Samarkand
SINKIAN
Kukuk
TAJIKISTAN
Kashgar
Tehran
Dushanbe
Yarkand
Hamadan
Marv
C H I N A
Mashhad
Khotan
Ahvaz
Esfahan
Herat
Kabul
Gilgit
Birjand
Peshawar
Jammu & Kashmir
Abadan
AFGHANISTAN
T I B E T
I R A N
Kuwait City
Islamabad
Shiraz
Kanoahar
Quetta
Lahore
Chandigarh
Zahedan
Saharanpur
BAHRAIN
Manamad
Bandar Abbas
P A K I S T A N
New Delhi
Kathmandu
QATAR
Doha
Indus
Aligarm
NEPAL
Abu Zhabi
Dubai
Gwadar
Hyderabad
Jodhpur
Kanpur
UNITED ARAB EMIRATES
Agra
Ganga
Karachi
Jaipur
Allahabad
Patna
Muscat
Al Hadd
I N D I A
Junagarh
Ahmadabad
Calcutta
OMAN
ARABIAN
Cuttack
Nagpur
Salalah
SEA
Mumbai
Vishakhapatnam
Pune
Hyderabad
Socotra (Yemen)
Kurnool
Nellore
Bangalore
Chennai
Laccadive Is. (India)
Mysore
Madurai
Jaffna
Kandy
Colombo
SRI LANKA

ہفت کشور

ملک کا نام	رقبہ مربع کلومیٹر	آبادی	دارالحکومت	مسلمان فیصد آبادی	خواندگی کی شرح فیصد	بڑی زبانیں	فی کس آمدنی	یوم آزادی
قزاقستان	2,717,300	18,960,352	آستانہ	70	99.8	رشین، قزاق	24,100 (2014)	16دسمبر1991ء
کرغیرستان	198,500	5,995,272	بشکیک	75	99.5	کرغیز	3300 (2014 est)	31اگست1991ء
ازبکستان	447,400	29,473,614	تاشقند	88	99.6	ازبک	5600 (2014 est)	1ستمبر1991ء
ترکمانستان	488,100	529,137	اشک آباد	89	99.7	ترکمان	14,200 (2014 est)	27اکتوبر1991ء
تاجکستان	143,100	8,330,946	دوشنبے	99	99.8	تاجک	2700 (2014 est)	9ستمبر1991ء
افغانستان	647,500	33,332,204	کابل	99.70	38.2	دری، پشتو	1900	19اگست1919ء
پاکستان	796,095	201,995,536	اسلام آباد	96.40	57.9	اردو	4700	14اگست1947ء
میزان	**5,437,995**	**303,779,241**						
انڈیا (بھارت)	3,165,596	1,266,883,584	نئی دہلی	14	66	ہندی، انگلش	2960	15اگست1947ء
چین	9,571,300	1,366,993,920	بیجنگ	2.4	93.3	منڈرین، چینی	6020	1اکتوبر1949ء
ریاستہائے متحدہ امریکہ	9,629,047	325,245,056	واشنگٹن ڈی سی	1.9	99.0	انگلش	54,400	4جولائی1976ء
یونائٹڈ کنگڈم	244,100	64,430,428	لنڈن	11	99.0	انگلش	36130	یو کے1801ء

چارٹ میں ان سب کی زبانیں الگ الگ لکھی ہوئی ہیں لیکن یہ الگ الگ نہیں ہیں۔ یہ سب دَری زبانیں ہیں۔ دری پرانی فارسی زبان ہے جسے پہلوی بھی کہتے ہیں۔ جدید فارسی سے لہجے کا فرق ہے۔ انہی علاقوں کے مسلمان حکمران اسے موجودہ پاکستان لائے تھے۔ اب یہ پاکستان میں کم اور اوپر تک زیادہ سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ علامہ مرحوم نے اسی زبان کو اپنے پیغام کا ذریعہ بنایا تھا۔ چنانچہ جاوید نامہ میں بعنوان ''حرکت بہ کاخ سلاطین مشرق'' نادر شاہ علامہؒ کو ان الفاظ میں خوش آمدید کہتا ہے ؎

خوش بیا اے نکتہ سنج خاوری اے کہ می زیبد ترا حرفِ دری

دری زبان کا پہلا رسم الخط ''عربی، فارسی'' From right to left تھا۔ روس نے اپنے دورِ استعماریت میں رومن، روسی انداز میں From left to right کر دیا اور اس میں کتابیں لکھوانا شروع کر دیں۔ اب ان کی جدید کتابیں اسی رسم الخط میں لکھی ہوئی ہیں لیکن پڑھتے وہی دری ہیں۔ البتہ سب پرانی کتابیں نئے لوگوں کے لیے بے کار ہو گئیں۔

ملاحظہ فرمائیں امریکہ (USA) کی آبادی اور ان ہفت کشور کی آبادی میں تھوڑا ہی فرق ہے لیکن USA کی 52 ریاستیں متحد ہو کر ایک ہو گئی ہیں اور دنیا کی عظیم طاقت شمار ہوتی ہیں اور آپ کی یہ سات ریاستیں ہیں، ان کی عالمی حیثیت کچھ نہیں۔ ان سات ریاستوں کے ساتھ ''ایک'' کہیں نہیں لگا ہوا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے ساتھ بھی ''ایک'' لگائیے۔ اپنا ایک نقطۂ نظر بنائیے۔ یہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک بے تیغ و تفنگ تسخیر ہو سکتی ہیں۔ لیکن ؎

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند آدمیت کم شد و اقوام ماند

جسم کے اندر روح نہ رہے تو ہفت اندام (سر، دو ہاتھ، دو پاؤں، پیٹ اور سینہ) باقی رہ جاتے ہیں جو کسی کام نہیں آتے۔ اسی طرح یہ ہفت کشور، یہ ہفت اندام، واضح مسلم اکثریت کا علاقہ ہیں۔ یہ اقوام میں تبدیل ہو کر غیر مؤثر ہو گئے ہیں۔ ایک ولولۂ تازہ، اسلامی روح کے ساتھ یہ جسدِ واحد کی طرح فعال ہو جائیں تو وہ علاقہ جو صدیوں نہیں، ہزاروں سال تک تمدنِ انسانی میں نمایاں مقام کا حامل رہا ہے، دوبارہ اپنا شرف حاصل کر لے گا۔ اس کی یہ نشأۃ ثانیہ، ایشیاء کے مسائل کو گتھیاں

سلجھا دے گی اور وحدتِ انسانی کی منزل قریب تر ہو جائے گی۔

علامہ اقبالؒ نے اس بارے جسے خطرہ سمجھا وہ اسے بار بار دہراتے رہے۔ ان کے دور میں ابھی پاکستان آزاد نہیں ہوا تھا۔ افغانستان کے ہاتھ استعماری طاقتوں نے باندھ دیئے تھے۔ باقی 5 ریاستیں روس کی زیرِ حکمرانی تھیں۔ علامہ کی بصیرت نے قریب ایک صدی قبل یہ دیکھا کہ یہ ریاستیں بااختیار ہو جائیں گی اور Independant States ''کشور'' بن جائیں گی۔ یہ بطور اقوام ابھریں گی اور ہفت اندام بے روح کی حیثیت اختیار کر لیں گی۔ اس نے قبل از وقت اس خطرے کو بھانپا اور وارننگ دی ؎

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ ایرانی — تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بے کراں ہو جا
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا — نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

اس لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے — نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا — ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی — اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گزر

یہ وہ خطرات تھے جو علامہ اقبال کے دل میں کھٹکتے تھے۔ ان کی بصیرت، نورِ قرآنی سے استفادہ کرتی تھی۔ قرآنِ کریم نے سورہ شوریٰ میں فرمایا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ (42:13)

ترجمہ: اسی (اللہ) نے مقرر کیا ہے تمہارے لیے دین کا وہ طریقہ جس کی تاکید کی تھی اس نے نوحؑ کو اور یہی وہ دین ہے جسے وحی کیا ہے ہم نے آپ (ﷺ) کی طرف اور وہ جس کا حکم دیا تھا ہم نے ابراہیم (علیہ السلام)، موسیٰ (علیہ السلام) اور عیسیٰ (علیہ السلام) کو اور وہ یہ ہے کہ ''قائم کرو دین کو اور نہ پھوٹ ڈالو اس میں''۔ بہت گراں ہے مشرکوں پر وہ بات، بلاتے ہو تم انہیں جس کی طرف۔۔۔

اللہ تعالیٰ نے یہ وارننگ دی تھی۔ یہ خطرات تھے جنہیں ہم نے درخورِ اعتناء نہیں سمجھا۔ ان خطرات کو ''مشرکوں''، اسلامی نظام کی مخالفین نے سمجھا اور ہمیں گروہوں، فرقوں اور قوموں میں تقسیم کر دیا۔ آج ہمارے ملکوں میں NGOs کام کر رہی ہیں جنہیں بالعموم دوسرے ملک Sponsor کرتے ہیں۔ ان کے Ambassadors، ان کے خفیہ بھیجے ہوئے لوگ ہمیں اختلافات، گروہ بندی اور تفرقہ انگیزی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ یہ دہشت گردی اسی کا نتیجہ ہے۔

یہ کچھ تو مشرکین، بظاہر مذہب پرست اور نظام اسلامی کے مخالف، کر رہے ہیں لیکن بحیثیت قوم ہم نے بھی مخالف سمت میں کچھ کردار ادا کیا ہے۔ گزشتہ 60 سال کے عرصہ میں علامہ اقبالؒ کو نصابِ تعلیمی سے غائب کر دیا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد کسی بھی جلسے کا آغاز تلاوتِ قرآن سے ہوتا تھا اور پھر کلام اقبال پیش کیا جاتا تھا۔ محفلوں اور تکیوں میں کلام اقبال گایا جاتا

تھا۔ مجھے ان کے گائے ہوئے اشعار اب بھی یاد ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ نوجوان جو گلیوں میں کلام اقبال گاتے پھرتے تھے، آج کیوں نہیں۔ علامہ اقبالؒ کا کوئی شعر حوالہ کے طور پر سنا دو تو کہتے ہیں کہاں لکھا ہوا ہے؟ علامہ اقبالؒ کو غائب کر دیا گیا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد ابتدائی اور ثانوی کلاسوں میں فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ وہی فارسی جسے دری کہتے ہیں، وہ نہیں جو ایران سے آئی تھی۔ یہی اُسی علاقے سے آئی ہوئی فارسی جو حکمران ساتھ لائے تھے۔ کیا ہوا؟ اب فارسی کورس میں شامل ہی نہیں۔ فارسی پڑھانے کے لیے استاد ہی نہیں ہیں۔ یہ دو سازشیں ایسی ہوئیں۔ ایک روس نے اس علاقہ میں رسم الخط (Alphabet) تبدیل کیا تا کہ نئی نسل اپنے آباء کی کتابیں نہ پڑھ سکے۔ دوسرے ہمارے درمیان رابطہ استوار ہو سکتا تھا فارسی (دری) زبان کے ذریعے۔ وہ آئیں تو ہم ان کی بات سمجھ سکیں اور وہ ہماری۔ ان سارے علاقوں قازقستان سے لے کر پاکستان تک دری زبان سمجھی جاتی تھی۔ اس کو پاکستان سے غائب کیا گیا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کو آپ Ignore نہیں کر سکتے۔ ان کا حل نکال سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی مشکلات ہیں۔ چند عشرے پہلے روس نے افغانستان میں اپنی فوجیں بھیج دیں۔ روس چاہتا تھا ان علاقوں کا راستہ ہمارے بلوچستان میں سے گرم سمندری پانیوں تک بنا دے۔ امریکہ اس میں حائل ہوا۔ اس نے کہا ہم آپ (پاکستانیوں، افغانیوں) کے ساتھ ہیں۔ ہم نے روس کو افغانستان سے نکال دیا۔ اس کے نکلنے کے بعد یہ پانچ ریاستیں بھی آزاد ہو گئیں۔ قدرت آپ کا راستہ بنا رہی ہے۔ ہم نہیں بنا رہے۔

سیالکوٹ میں ایک پورٹ بنی ہوئی ہے، اسے ڈرائی پورٹ کہتے ہیں۔ لاہور میں بھی ہے۔ کراچی والی پورٹ کو Seaport کہتے ہیں۔ میں آپ کی توجہ ایک نہر کی طرف مبذول کراتا ہوں۔ یہ نہر سویز ہے۔ یہ بحیرہ روم کو بحیرہ قلزم سے ملاتی ہے اور پھر Indian Ocean سے ملاتی ہے اور یوروپ کی ایشیائی اور مشرقی ممالک سے تجارت کا ذریعہ ہے وہ Wet canal ہے۔ ستر کی دہائی میں وہ نہر بند ہو گئی تو مصر نے واویلا مچایا کہ میری تو معیشت تباہ ہو گئی۔ مصر کا صدر شاہ فیصل کے پاس گیا کہ یا تو مجھے معاشی سہارا دیں یا اس نہر کو کھلوائیں۔ اتنی اہمیت تھی اس 100 میل لمبی WET CANAL کی۔ آپ کو قدرت نے ایک DRY CANAL دی ہے کہ پانی تو نہیں اس میں لیکن کینال کا جو فنکشن وہاں مصر میں ہے، وہ آپ کو یہاں میسر آ سکتا ہے۔ یہ نہر چین کا شغر سے چلے گی جو پہلے ہی پانچ اسلامی ریاستوں سے مواصلاتی طور پر ملا ہوا ہے اور پاکستان سے گزرتی ہوئی گوادر پورٹ تک جائے گی۔ یہ ڈرائی کینال ہے۔ اسے آپ محسوس (feel) کریں۔ علامہ اقبالؒ نے اس کا کس طرح تصور کیا۔ انہوں نے نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند رکھا اور اپنے آئینۂ ادراک میں اس کی جھلک دیکھی۔

اس نے ہفت کشور کا نظارہ کیا۔ پھر اسے ہفت اندام کی صورت میں دیکھا۔ کہ ہفت اندام تو رہ گیا، قوم نہیں رہی، انسانیت نہیں رہی کہ محض اندام تو کچھ نہیں ہوتے لیکن وہ پُر اُمید تھے کہ ؎

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ سامان بھی ہے

یہ تھا علامہ اقبالؒ کا دوسرا خواب کہ ان کے کلام کے اثر سے ''ہفت کشور'' میں یکجہتی کا مرحلہ بالآخر پُر امن طریقہ سے طے ہو گا اور خلافت کی بِنا، دنیا میں پھر سے استوار ہو گی۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حکمت کی باتیں

(انتخاب از خطباتِ اقبال)

(1) عقل اور ایمان علم ہی کے دو پہلو ہیں۔

(2) کسی شے کا جاننا اور اس کے معنی و مطلب سمجھنا ایک ہی بات ہے۔

(3) ہم قرآنِ مجید کا مطالعہ بطور ایک کتاب کے کریں۔ یہ نہیں کہ پہلے سے قائم شدہ افکار اور تصورات کو لے کر اس سے اپنے ارادوں اور مقاصد کی تائید اور جواز کا سہارا ڈھونڈیں۔

(4) یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے اعمال و افعال کی بنا کسی ایسے اصول پر رکھیں جو بجائے خود مشتبہ ہو۔

(5) ٹھیک کہا گیا ہے (میری نظر میں بھی) کہ کانٹ (فلاسفر) ہی کی ذات وہ سب سے بڑا عطیہ ہے جو خدا نے جرمنی کو عنایت کیا۔

(6) فکر میں حرکت پیدا ہوتی ہے تو محض اس لئے کہ اس کی متناہیت میں لامتناہی بھی مضمر رہتا ہے۔

(7) جہاں تک علم و حکمت کا تعلق ہے، مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔

(8) انسان کو تسمیہ اشیا کی قدرت حاصل ہے۔ یعنی وہ ان کے معنی قائم کرسکتا ہے اور معانی کا قائم کرنا گویا ان کو اپنے قابو میں لے آنا ہے۔

(9) صرف نظریوں کی بنا پر کوئی پائیدار تمدن قائم نہیں رہ سکتا۔

(10) اگر معلول کے لئے علت کا وجود ناگزیر ہے تو علت کے لئے بھی معلول کا، ورنہ علت، علت نہیں رہے گی۔

(11) کسی مقصد کے اشارے؟ آگے بڑھنا گویا اس چیز کی طرف بڑھنا ہے جس کے لئے آگے بڑھنا چاہئے تھا۔

(12) ہماری تکوین کی صورت ہی یہ ہے کہ ہم وہ کچھ نہ رہیں جو ہیں۔

(13) خودی عبارت ہے ''میں ہوں'' سے۔

(14) فطرت کو ذاتِ الٰہیہ سے وہی نسبت ہے جو سیرت اور کردار کو انسانی ذات سے۔

(15) جب ہم زندگی کا مطالعہ عقل کی عینک سے کرتے ہیں، تو اس کی انتہا وحدۃ الوجود پر ہوتی ہے۔

(16) باصطلاح قرآنی عمل تخلیق اور شے مخلوق میں کوئی فرق نہیں۔ ہم جسے شے کہتے ہیں وہ صرف ان اعمال کا مجموعہ ہے جن کا اظہار جواہر کی شکل میں ہو رہا ہے۔

(17) جوہر کی مسلسل ہستی کا دارومدار اعراض کی مسلسل تخلیق پر ہے۔

(18) بحیثیت قدرتِ الٰہیہ کی ایک شان کے جوہر کی ماہیت خالصتاً روحانی ہے۔ گویا نفس محض عمل ہے اور جسم اس عمل کی مرئی ''اس لئے قابلِ پیمائش'' شکل۔

(19) بزمِ ہستی میں ہر کہیں خودی ہی کا نغمہ لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہا اور ذاتِ انسانی میں اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے۔

(20) ذات الٰہیہ کی اولیت زمانے کی اولیت کا نتیجہ نہیں، بلکہ زمانے کی اولیت ذاتِ الٰہیہ کی اولیت کا نتیجہ ہے۔

(21) استدلالی علم ایک زمانی عمل ہے۔ لہٰذا اس کا ایک ماضی ہے، ایک حال اور ایک مستقبل۔

(22) ہمارے پاس اس علم کے لئے کوئی لفظ نہیں جو اپنے معلوم کا آپ ہی خالق ہے۔

(23) یہ صحیح ہے کہ ذات الٰہیہ کی حیات تخلیقی میں جس کی ماہیت ایک وحدتِ نامیہ کی ہے، مستقبل کا وجود پہلے سے قائم ہے، لیکن ایک غیر متعین امکان، نہ کہ حوادث کی ایک ایسی ترتیب کی صورت میں جس کا خاکہ مدت ہوئی تیار ہو چکا تھا۔

(24) ذاتِ الٰہیہ کی اپنی تخلیق آزادی ہے جس کی اس نے تحدید کی تو اس لئے کہ نفسِ متناہیہ بھی اس کی زندگی، طاقت، آزادی اور اختیار میں حصہ لے سکے۔

(25) قرآن مجید میں مقصد عالمگیر اخلاقی سبق، یا کوئی عالمگیر فلسفیانہ حقیقت کا اجاگر کرنا ہوتا ہے۔

(26) آدم کے لفظ کا اشارہ کسی مخصوص انسان کی طرف نہیں۔ اس کی حیثیت ایک تصور (آدمی) کیرئر ہے جس کی تائید قرآنِ پاک سے بھی ہو جاتی ہے۔

(27) جنت کا اشارہ حیاتِ انسانی کے اس ابتدائی دور کی طرف ہے جس میں انسان کا اپنے ماحول سے ابھی عملاً کوئی رشتہ قائم نہیں ہوا تھا، لیکن جو گویا تمہید ہے تہذیب وتمدن کی۔

(28) انسان کی حیثیت خود بھی اپنی جگہ ایک سبب کی ہے۔

(29) انسان کی پہلی نافرمانی وہ پہلا اختیاری عمل تھا جو اس نی اپنی ارادے اور اپنی مرضی سے کیا۔ اس لئے آدم کا یہ گناہ معاف کر دیا گیا۔

(30) آزادی خیر کی شرطِ اولین ہے۔

(31) دراصل ایسی کوئی حقیقت ہی نہیں جس کا وجود سب سے الگ تھلگ ہو، اس لئے کہ ہر حقیقت اپنی جگہ پر ایک ''کل'' ہے۔

(32) غلطی یا خطا بھی، باوجودیکہ ہمیں اس کو ایک ذہنی شر سے تعبیر کرنا پڑے گا، حصولِ تجربات میں ناگزیر ہے۔

(33) بحیثیت ایک ایسے وجودِ زمانی کے جس کو ہر لحظہ موت کا خطرہ ہے' انسان کچھ کر سکتا تھا' تو یہی کہ اپنا سلسلہ نسل جاری رکھے اور یوں بطورِ فرد نہیں تو کم از کم اپنی نسل ہی کے لئے بقائے دوام کی نعمت حاصل کر لے۔

(34) مذہب کے لئے یہ ممکن نہیں کہ صرف تصورات پر قناعت کرے۔

(35) شعورِ نبوت کی صورت میں دعا کی نوعیت سرتاسر تخلیقی ہوتی ہے' یعنی ان سے ایک نیا جہانِ اخلاق وجود میں آتا ہے۔

(36) دراصل علم کی جستجو جس رنگ میں بھی کی جائے' عبادت ہی کی ایک شکل ہے۔

(37) ہمارے لئے بصیرت اور طاقت کا امتزاج ضروری ہے تاکہ عالمِ انسانی روحانی اعتبار سے آگے بڑھ سکے۔

(38) عبادت کی شکل کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس سے ہم انسانوں میں بحث ونزاع کا دروازہ کھل جائے۔

(39) اسلام نے عبادت کے لئے ایک مخصوص سمت انتخاب کی تو محض اس لئے کہ جماعت کے اندر ایک ہی قسم کے جذبات موجزن ہوں۔

(40) صلوٰۃ باجماعت سے مقصود ہے کہ سب امتیازات کو مٹاتے ہوئے عملی زندگی میں وحدت کا اظہار حقیقت کے طور کرنے لگیں۔

(41) (شاہ ولی اللہ) ہمارا فرض ہے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سرِ نو غور کریں۔

(42) ہمیں اپنی آزادی رائے برقرار رکھتے ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اسلامی تعلیمات کی تعبیر اب علم حاضر کے پیشِ نظر کس رنگ میں کرنی چاہئے' خواہ ایسا کرنے میں ہمیں اپنے اسلاف سے اختلافات ہی کیوں نہ ہُوں۔

(43) میرے فیصلے اور میرے عزائم میری اور صرف میری ذات کا حصہ ہیں۔ خدا بھی تو ایسا نہیں کرے گا کہ میری جگہ خود محسوس کرنا یا حکم لگانا شروع کر دے' یا یہ کہ اگر ایک کی بجائے دو راستے میرے سامنے ہیں تو خود ان سے ایک کا انتخاب کر لے۔

(44) میرا کسی شخص یا کسی مقام کو پہچاننا میری ہی گذشتہ واردات پر مبنی ہوتا ہے جس کا اظہار ہم لفظ ''میں'' سے کرتے ہیں۔

(45) ''خودی'' یا ''انا'' کی حیثیت ایک سادہ' ناقابلِ تجزیہ اور ناقابلِ تحول (غیر متبدل) جوہرِ روحانی کی ہے' جسے کیفیات نفسی کے سارے مجموعے سے کلیتاً مختلف' علی ہذا مرورِ زمانہ کے اثرات سے سرتاسر آزاد تصور کیا جاتا ہے۔

(46) کانٹ کہتا ہے یہ ''میرا خیال'' جو ہمارے ہر خیال کا (اظہارِ خیال کے لئے) مستلزم ہے' محض ایک ضابطے کی بات ہے اور اسے حقیقت ٹھہرانا منطقی اعتبار سے حجت نہیں رکھتا۔

(47) خودی ایک گذرتے ہوئے ارتعاش کا ابھرتے ہوئے ارتعاش اور اس ابھرتے ہوئے ارتعاش کا بعد میں ابھرنے والے ارتعاش سے کام لینے کا عمل ہے۔

(48) جب ہم کسی شے کا ادراک کرتے' یا اس پر حکم لگاتے' یا کوئی ارادہ کرتے ہیں تو ایسا کرنے میں خودی ہی سے آشنا

ہوتے ہیں۔

(49) میں شے نہیں عمل ہوں۔

(50) اہم بات یہ نہیں کہ کسی چیز کی ابتدا کیوں کر ہوئی' بلکہ یہ کہ اس کی انتہا کیا یعنی رسائی کہاں تک ہے۔

(51) شروع شروع میں تو اگرچہ طبع کا نفس پر غلبہ ہوتا ہے' لیکن پھر جیسے جیسے نفس طاقت حاصل کرتا ہے طبع پر چھا جاتا ہے اور اس لئے عین ممکن ہے آخر الامر اس سے بالکل آزاد ہو جائے۔

(52) تقدیر پرستی (قسمت) نتیجہ تھی بعض فلسفیانہ افکار اور کچھ سیاسی مصلحت پسندیوں کا۔

(53) خودی کی نشوونما کا معراجِ کمال یہ ہے کہ ہم خودی سے براہِ راست اتصال میں بھی جو سب پر محیط ہے' اپنے آپ کو قائم اور برقرار رکھ سکیں۔

(54) جس ہستی کی ارتقاء میں لاکھوں کروڑوں برس صرف ہوئے اس کے متعلق یہ کہنا کچھ غیر اغلب سا نظر آتا ہے کہ وہ ایک عبث اور لاحاصل شے کی طرح ضائع ہو جائے گی۔

(55) ہستی ایک روز افزوں خودی کی حیثیت سے ہی کائنات کے مقصود و مدعا میں شریک ہوگی۔

(56) قرآن پاک کی رو سے یہ عین ممکن ہے کہ ہم انسان کائنات کے مقصود و مدعا میں حصہ لیتے ہوئے غیر فانی ہو جائیں۔

(57) اعمال کا نتیجہ نہ تو لطف ہے نہ درد۔ اعمال یا تو خودی کو سہارا دیتے ہیں یا اس کی ہلاکت اور تباہی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

(58) بقائے دوام انسان کا حق نہیں۔ اس کے حصول کا دارومدار ہماری مسلسل جدوجہد پر ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم اس کے امیدوار ہیں۔

(59) خودی نے اپنے عمل اور سعی کی بدولت اگر اسی زندگی میں اتنا استحکام پیدا کر لیا ہے کہ موت کے صدمہ سے محفوظ رہے تو اس صورت میں موت کو بھی ایک راستہ ہی تصور کیا جائے گا۔

(60) بعث بعد الموت کوئی خارجی حادثہ نہیں۔ یہ خودی کے اندر ایک حیاتی عمل کی تکمیل ہے۔

(61) قرآن مجید کی روشنی کے مطابق' رومی بقائے دوام کے مسئلے کو ارتقائے حیات ہی کا ایک مسئلہ ٹھہراتا ہے۔

(62) حکمائے عصرِ حاضر نے بغیر کسی دلیل کے یہ فرض کر لیا ہے کہ ہم انسان اپنے ارتقاء کی جس منزل میں ہیں' ہمارے ارتقاء کی آخری منزل ہے۔

(63) قرآن مجید نے جن مماثلتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان سے مقصود صرف یہی ظاہر کرنا ہے کہ بعثِ ثانیہ ایک حقیقت ہے یہ نہیں کہ اس کی ماہیت کیا ہے۔

(64) جنت اور دوزخ اس کے احوال ہیں مقامات یعنی کسی جگہ کا نام نہیں۔

(65) دوزخ انسان کے اندر بہ حیثیت انسان اپنی ناکامی کا دردانگیز احساس ہے۔

(66) بہشت کا مطلب ہے فنا اور ہلاکت کی قوتوں پر غلبے اور کامرانی کی مسرت۔

(67) انسانی سیرت کا تقاضا ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرے اس میں سختی اور پختگی پیدا ہوتی جائے۔

(68) عذاب درحقیقت تادیب کا ایک عمل ہے تاکہ جو خودی پتھر کی طرح سخت ہوگئی ہے وہ پھر رحمت خداوندی کی نسیم جاں فزا کا اثر قبول کر سکے۔

(69) خودی کی زندگی اختیار کی زندگی ہے، جس کا ہر عمل ایک نیا موقعہ پیدا کرتا ہے۔

(70) جو کوئی اندھوں کی طرح آیاتِ فطرت سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے، وہ آگے چل کر بھی اندھا ہی رہے گا۔

(71) دنیائے قدیم کو عہد قبل سائنس کی دنیا تصور کرنا چاہئے۔

(72) اجتہاد اسلام کی ہیتِ ترکیبی کے اندر حرکت اور تغیر قائم رکھتا ہے۔

(73) نظری طور پر اہل سنت والجماعت نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا، لیکن محال شرطیں لگا کر اسے ناممکن بنا دیا ہے۔

(74) ماضی کا غلط احترام، اسلام کی اندرونی روح کے منافی تھا۔

(75) تہذیب جدید کو، جس کی بنا وطنی انانیت پر ہے، انسان کے دورِ وحشت اور بربریت ہی کی ایک شکل تصور کرنا چاہئے۔

(76) تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن فرسودہ خیالات کو خود کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو، ان کی تجدید پھر اس قوم میں نہیں ہو سکتی۔

(77) ہمارا ذہن ایک ایسے بین الاقوامی نصب العین کی طرف حرکت کر رہا ہے جو گویا اسلام کا منتہائے نظر ہے۔

(78) بین الاقوامی دنیا میں کمزوروں سے کوئی ہمدردی نہیں کرتا۔ یہاں صرف طاقت کا احترام کیا جاتا ہے۔

(79) اسلام نہ تو وطنیت ہے، نہ شہنشاہیت بلکہ ایک انجمن اقوام جس نے ہمارے خود پیدا کردہ حدود اور نسلی امتیازات کو تسلیم کیا ہے تو محض سہولتِ تعارف کے لئے۔ اس لئے نہیں کہ اس کے ارکان اپنا اجتماعی مطمحِ نظر محدود کر لیں۔

(80) (ہابس) ایک ہی قسم کے خیالات اور احساسات کے تسلسل کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارے کوئی خیالات اور احساسات ہی نہیں۔

(81) حسبنا کتاب اللہ (ہمارے لئے اللہ کی کتاب ہی کافی ہے۔) کی وہی روح جس کا اظہار حضرت عمرؓ کی ذات میں ہوا تھا، وہی اخلاقی جرات اپنانے کا وقت ہے۔

(82) مسلمانوں کی ہر نسل کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلاف کی راہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے۔ یہ نہیں کہ اسلاف کو اپنے لئے ایک رکاوٹ تصور کرے۔

(83) مسلمانوں کے یہاں جو مجموعہ ہائے احادیث معتبر ٹھہرائے جاتے ہیں‘ ان کا زائد حصہ فی الواقعہ اسلام کے ظہور اور ابتدائی نشوونما کی حقیقی تاریخ ہے۔

(84) ہمیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ نبوی دور کے جس رسم ورواج کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا‘ اس پر کیا سچ مچ ہر کہیں اور ہر زمانے میں عمل کرنا مقصود تھا۔

(85) (شاہ ولی اللہ) چونکہ فقہی احکام مقصود بالذات نہیں‘ اس لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لئے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔

(86) فقہائے متاخرین کو ذخیرہ علم کی دستیابی کی صورت میں اجتہاد کے لئے زیادہ آسانیاں ہیں۔

(87) تجربہ کہتا ہے کہ جس حق وصداقت کا انکشاف عقلِ محض کی وساطت سے ہوا‘ اس سے ایمان ویقین میں وہ حرارت پیدا نہیں ہوتی جو وحی وتنزیل کی بدولت ہوتی ہے۔

(88) سائنس کے جدید اکتشافات کو دیکھئے تو عقلاً بھی الٰہیات کے ایک مرتب نظام کی تشکیل کچھ زیادہ دشوار نظر نہیں آتی۔

(89) یہ صرف معانی ہیں جن میں ہم دوسروں کو شریک کر سکتے ہیں۔

(90) یہ سیرت وکردار ہی تو ہے جس سے انجام کار صاحبِ کردار کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔

(91) خودی کا نصب العین یہ نہیں کہ کچھ دیکھے بلکہ یہ کہ کچھ بن جائے۔

(92) انسان کی حقیقت کا انکشاف ''میں سوچتا ہوں'' سے نہیں بلکہ ''کر سکتا ہوں'' سے ہوگا۔

(93) دنیا محض دیکھنے یا افکار وتصورات کی شکل میں سمجھنے کی چیز نہیں‘ بلکہ ایسی چیز ہے جس کو ہم مسلسل عمل سے بار بار بناتے اور بنا کر پھر بناتے رہتے ہیں۔

(94) اگر عقلِ نظری ہی وہ استعداد ہے جو حقیقت کا ادراک کر سکتی ہے تو یہ ادراک صرف معقول تک محدود رہے گا۔

(95) صلوٰۃ بھی دعا ہی کی ایک شکل ہے۔

(96) مذہب میں خودی کا تعلق کسی ایسی حقیقت سے قائم نہیں ہوتا‘ جو ہماری ذات سے باہر اور خارج میں واقع ہو۔

(97) جب تک انسان کو اپنے آغاز اور انتہا کی کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی‘ وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آ سکتا۔

(98) روحانی زوال کی حالت میں لوگ اپنے اکابر مفکرین کو بتوں کی طرح پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔

(99) عہدِ حاضر کے مسلمان کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ اپنی آزادیِ ذہن کو خود اپنے ہاتھوں قربان کر دیں۔

(100) قرآن مجید کا مطمحِ نظر جمود کی بجائے حرکت پر رہا۔ لہٰذا اس کی روش ارتقاء کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر شگفتہ طاہر، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفرقہ عذاب ہے یا جزاء الخیر

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

اسلام کی دعوت کا منتہیٰ تو یہ ہے کہ وہ تمام نوعِ انسانی کو عالمگیر برادری بنانا چاہتا ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسا صرف اُس صورت میں ممکن ہوتا ہے جب آئیڈیالوجی (نظریہ حیات) یکساں ہو۔ دوسری جانب اِصرارُ خداوندی ہے کہ ہم کسی انسان کے اختیار و ارادے کو سلب کر کے امت واحدہ نہیں بنانا چاہتے۔ انسانوں کو ایسا اپنے اختیار اور ارادے سے کرنا ہو گا (5:48)، (16:93)، (42:8)، (43:33)۔

اب آیئے اُمتِ مُسلمہ کے موجودہ حالات میں وجود و جمود کی طرف جس کی آئیڈیالوجی (نظریہ حیات) ایمان محکم ہے اور جو اپنی وحدت کا مرکز آج بھی کعبہ کو ہی تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ وحدتِ قانون (قُرآن) اور وحدتِ مرکز (کعبہ) پر اس امت کے نظام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

اختلاف اور تفرقہ سے یہ اُمت، اُمتِ مُسلمہ رہتی ہی نہیں۔ کیا ہم اس حقیقت سے چشم پوشی کر کے اپنے قانونِ وحدت (قُرآن) سے رُوگردانی نہیں کر رہے۔ یقیناً! یہ مقام غور طلب ہے، کہ جو نقشۂ اُمت آج ہم اقوامِ عالم کو پیش کر رہے ہیں، وہ سراسر خلافِ قانونِ وحدت ہے۔ لہٰذا جس طرح دیگر اقوامِ عالم، آج اُمتِ مسلمہ کو زچ کرنے کے لیے حربے استعمال کرتی ہیں وہ ہمارے لیے یقیناً باعثِ اذیت ہیں۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ وہ کس کس طرح اپنا بارِ شرمندگی امتِ مُسلمہ کی ہنسی اڑا کر اُتارتے ہیں۔

ہم اپنی بنیاد پر اس ضرب کاری کو سمجھنے کی کوشش اِس آئینے میں دیکھتے ہوئے کریں جس پر ہمارا ایمان ہے سوچئے کہ کیا یہ کوئی عذاب کی صورت تو نہیں۔

حکم خداوندی ہے (اُمت مسلمہ کے لیے):

1۔ تم اُن لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے باہمی تفرقہ پیدا کر لیا اور عذاب خداوندی کے مستحق قرار پا گئے۔ ایمان لانے کے بعد فرقہ بندی کفر ہے۔ (3:105-106)۔

2۔جن لوگوں نے دین میں فرقے پیدا کر لیے رسول ﷺ کا اُن سے کوئی واسطہ نہیں۔(۶:۱۵۹)۔

3۔ایسی مسجد کی تعمیر جس سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہوتا ہو کفر ہے اس میں کسی کو قدم تک رکھنے کی اجازت نہیں (9:108۔110)اور فرمایا کہ صلوٰۃ وحدت کا موجب ہونی چاہیے(30:31۔32)۔

4۔پھر متنبہ کیا کہ دیکھنا! تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔یعنی اُن میں سے جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر لیے اور پھر ہر فرقہ یہ کہنے میں مگن ہو گیا کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل ہیں۔(23:53)‘(30:31)۔

اب اگر ہم سے کوئی کہتا ہے کہ رسول ﷺ نے پیشگوئی کی تھی کہ اُمتِ مسلمہ کے بھی ۷۰ فرقے بن جائیں گے تو وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ تو بہر حال ہونا ہی تھا۔لہٰذا پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے!

اتنے واضح قرآنی احکامات جو اپنی اٹل حقیقتوں کے ساتھ‘ اپنے دعوؤں میں سچ کی تابنا کی لیے ہوئے موجود ہیں اور ہم اپنے اعمال وافکار کو درست ثابت کرنے کے لیے غیر قرآنی دلائل کا سہارا لیں تو یہ خود اپنی ہنسی اُڑانے کے مترادف بات ہوگی۔

اُس کے بعد پھر اصرار یہ بھی ہو کہ قرآن میں جو لکھا ہے وہ سمجھنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ کہاں چھوٹی سی عقل میں اتنی بڑی بات سما سکتی ہے لہٰذا جو تمہیں واعظ یا حضرت مفتی صاحب بتا دیں وہ کافی ہے جنت حاصل کرنے کے لئے!

دنیا کے حالات تو ایسے ہی رہیں گے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو کیا مشکل بات تھی‘ ساری انسانیت راہِ راست پر آ جاتی۔قرآن پڑھو‘ ذکرِ الٰہی کرو‘ ثواب کماؤ اور اپنی قبر کی فکر کرو! سوچئے نزولِ قرآن کی غرض وغایت اس قسم کی تبلیغ سے کس طرح بدل چکی ہے۔آج اُمتِ مسلمہ جس دلدل میں دھنسی جا رہی ہے یہ مقامِ عبرت ہے۔کیا ہم نے قرآن کی تعلیمات چھوڑ کر اسلاف پرستی کا راستہ نہیں اپنا لیا؟ اُس کے بعد جب یہ بھی کہا جائے کہ معاذ اللہ! قرآن میں احکامات ہی بغیر ربط کے ہیں‘ بہر حال ہم تو صاف انحراف اسی کو کہیں گے۔

کہا جاتا ہے اللہ نے قرآن کو یاد کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے جبکہ قرآن تو صرف کتاب عمل ہے کہیں یاد کرنے پر زور نہیں دیا گیا قرآن کو سمجھ کر عمل کرنے کی ضرورت اب یاد کر لینے سے پوری کی جاتی ہے تو اعمال کا حال یہی ہوگا۔

قارئین کرام قرآن کی آیات ایک عام انسان کے لیے اُتاری گئی ہیں لہٰذا وہ کسی بھی مکتبہ فکر اور سوچ کے حامل انسان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔

قرآن کا مخاطب خود حضرتِ انسان ہے جو اپنے عقل کُل ہونے کے دعوے پر اکثر نازاں رہتا ہے‘ قرآن اُسی عقلِ بیباک کی رہنمائی کرنے کے لئے نازل ہوا ہے۔اگر اسے یہ نعمت حاصل ہو جائے تو وہ عقل نوعِ انسانی کے لیے باعث منفعت بن جاتی ہے فرمایا گیا کہ

1۔جو اپنے فہم وبصیرت سے کام نہ لے اُسے رسول ﷺ کی تبلیغ بھی فائدہ نہیں دے سکتی۔(القرآن‘(43۔10:42)‘ (81۔27:80)‘(53۔30:52)‘(35:22)‘(43:40)۔عقل والے وہ ہیں جو قرآن کو بغور سنتے ہیں اور پھر بطریقِ

احسن اُس پر عمل کرتے ہیں (39:18)۔ مومن خدا کی آیات کے سامنے بھی اندھے، بہرے بن کر نہیں جھک جاتے (25:73)۔ قرآن کا اتباع کرنے والے ہی اہلِ حق ہیں (39:18)۔ ان احکامات سے ایک عام فہم وشعور رکھنے والا انسان بھی اپنے لیے لائحہ عمل تیار کرسکتا ہے، کسی مفکر کے لیے تو اس میں بیش قیمت خزانے ہیں۔ جن کو سمجھنے کے لیے صرف ذہنی بالیدگی اور پختگی کی ضرورت ہوتی ہے اُس کے لیے کسی خاص ٹریننگ کی یا دارالعلوم سے ڈگری حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔

اب دیکھئے نظریہ قرآن کے تحت حیوان اور انسان میں امتیاز کس شئے سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقل ہے اب جس نظریہ زندگی میں عقل کو سَلب کر دیا جائے اور دین میں سمجھ بوجھ حاصل کرنے کو Discourage کیا جائے تو قرآن کی رُو سے انسان، حیوان سے بھی بدتر ہوجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے عقل و دانش سے کام نہ لینے والوں کو شَرَّ الدَّوَآبِّ (8:22) (بدترین خلائق) سے اور حیوانات سے بھی گئے گزرے قرار دیا ہے۔

اب اس حقیقتِ کُبریٰ پر غور کریں کہ قرآن نے اسلاف کی اندھا دھند تقلید اور اپنی عقل وفکر سے کام نہ لینے والوں کا مقام جہنم بتایا ہے (70-37:69)۔

ایک لمحے کے لئے ٹھہر کر سوچئے! کیا ہمیں اپنے ہدایت نامہ کی طرف، صرف رہنمائی حاصل کرنے کے لیے رجوع کرنا چاہیے؟ اس سوال کا جواب خود آپ کے اختیار وارادہ پر ہے۔ کوئی انسان کیا جرأت کرے گا کہ کسی کو اپنی بات منوائے، اس کا اعادہ تو خود رب کائنات نے انسان کے اپنے ارادے واختیار پر موقوف کر دیا ہے۔ انسان اگر چاہے تو قوانین خداوندی کی اتباع کر کے اپنی زندگی جنت نظیر بنالے اور چاہے تو جہنم کدہ۔ اُخروی زندگی تو اسی زندگی کا ماحصل ہے اس سے الگ تو بالکل نہیں ہے۔

قرآن کی رہنمائی تمام دنیا کے انسانوں کے لیے ہے۔ چاہے وہ کسی رنگ، نسل، زبان، علاقے یا فرقے سے تعلق رکھتے ہوں سب کے لئے یکساں مُفید ہوسکتی ہے۔ زندگی کے جن اصولوں کو اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا ہے وہ بے حد وُسعت لیے ہوئے ہیں اور ہر دور میں قابلِ عمل ہیں۔ اگر انسان چاہے تو ان آیات کی تشریح اپنی بھلائی کو سامنے رکھتے ہوئے کرتا رہے اگر وہ تشریحات، انسانی مفادات ومنفعت کے لحاظ سے موجبِ زندگی ہونگے تو اُن کو تقویت ملتی رہے گی۔ اُن سے زندگی نشوونما پاتی رہے گی۔

اگر وہ ان سے ہلاکتِ انسانی کے اصول مرتب کرے گا تو اس کا نتیجہ یقیناً تباہی ہوگا جو کہ آج مسلمانوں کی حالتِ زار سے صاف ظاہر ہے۔ اب ذرا اقوامِ غیر پر طائرانہ نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب انہوں نے مستقل اقدار کے قوانین کو اخذ کر کے اپنے یہاں وضع کر دیا تو اُن کی حالت بہتر ہوگئی، وہ خزائن ارض وسماء سے مستفید ہونے لگے۔ انہیں قرآن کے الفاظ و معنیٰ سے کوئی عقیدت نہیں ہے وہ تو صرف یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس کائنات کے خالق نے اپنی آسمانی کتاب میں جن رازوں سے پردہ اُٹھایا ہے اُن سے فائدہ کیسے اُٹھانا چاہیے۔

اُن کے برعکس ہم جو عقیدت مندی کا تاج سروں پر سجائے ہر آن آمَنَّا صدَّقنا کہہ کر خود کو دھوکا دیتے ہیں۔ انہی احکامات میں کجی تلاش کرتے ہیں۔ اپنی اصلاح کرنے کی بجائے قوانین الٰہی کو اپنی مرضی ومسلک کے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔

یوں ہم اس بھاری ذمے داری کو جو ایک مسلمان ہونے کی بناء ہم پر عائد ہوتی ہے، ہم بَری ذِمہ ہو جاتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے ہمارے مسلک میں یہ اس طرح نہیں کہا۔ لہٰذا ہم اس بات کو نہیں مان سکتے اور دوسری جانب عبادات کو خشوع و خضوع کے ساتھ منعقد کر دینے سے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ حق ادا ہو گیا۔

دوسری جانب اصرارِ ربِ کائنات ہے کہ دین میں مکمل داخل ہو جاؤ۔ بتایئے کیا ہم اپنے دین کے ساتھ خود مذاق نہیں کرتے؟ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر آتا ہے کہ:

1۔ تمام انبیاء کرام امتِ واحدہ کے افراد تھے۔ اُن کی وجہ جامعیت خدا کی محکومیت تھی، لیکن لوگوں نے باہمی اختلاف پیدا کر لیے (21:92-93)، (42:13-14)۔

2۔ یہودیوں کی حالت یہ تھی کہ بظاہر وہ ایک قوم نظر آتے تھے لیکن اُن کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ تھے۔ اس لیے اُن پر عذاب طاری ہو گیا اور وہ تباہ ہو گئے (59:13-14)۔

3۔ قوموں میں عذاب کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ پارٹیوں میں بٹ جائیں گے اور پھر یہ پارٹیاں ایک دوسرے سے الجھتی رہیں (6:65)۔

4۔ بنی اسرائیل ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے یہ خدا کا عذاب تھا (7:167)۔

5۔ قومِ سبا کو ریزہ ریزہ کر کے پراگندہ کر دیا۔ یہ خدا کا عذاب تھا پھر اُن کی صرف داستانیں باقی رہ گئیں (34:19)۔

6۔ فرعون کا جرم عظیم یہ تھا کہ وہ قوم میں تفرقہ ڈال کر انہیں پارٹیوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔

ابتداً خطا انسان خود کرتا ہے اور پھر وہ اپنے اعمال کا انجام خدا کے بنائے ہوئے نظام کے تحت قانون مکافاتِ عمل کے عین مطابق حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ خدا کسی شخص یا قوم پر عذاب مسلط نہیں کرتا جب تک کہ وہ قوم یا شخص خود اپنے لیے تباہی و بربادی کا راستہ نہ ڈھونڈ لے اور پھر خود اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھے میں جا گرے۔

قرآن کریم حکمت و دانائی کی مثالوں کو اکثر واقعات کے ساتھ بیان کرتا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کر سکیں۔ جیسے کہ فرمایا، جب حضرت موسیٰ علیہ سلام نے اپنے بھائی حضرت ہارونؑ سے پوچھا کہ آپ نے بنی اسرائیل کو بچھڑے کی پرستش سے کیوں نہیں روکا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں ڈرتا تھا کہ قوم میں تفرقہ نہ پڑ جائے (20:94)۔ گویا تفرقہ جیسی بڑی خرابی سے بچنے کے لیے، شرک جیسی جہالت و گمراہی کو بھی وقتی طور پر برداشت کرنا پڑ سکتا ہے۔ مصلحت و دانشمندی سے مسائل کو سلجھانے کا حکم ربِ کائنات نے دیا ہے جس پر تمام انبیاء کرام عمل کرتے چلے آئے۔ اُس کے بعد یہ ذمہ داری اُمتِ مسلمہ کے حوالے کر دی گئی۔

قارئینِ کرام! پیغامِ خداوندی آج بھی اُتنا ہی واضح اور مکمل ہے۔ جو اِس دنیا کے وجود میں آنے کے بعد سے آج تک جاری و ساری ہے اس دنیا کے پہلے انسان سے لے کر آخری انسان تک قابلِ عمل اور حاملِ حکمت ہے۔ اِس کتابِ محکم کے الفاظ اٹل، روشن دلیلوں کے ساتھ، کوہ ہمالیہ کی طرح مضبوط، بلند و بالا اور غیر متبدل ہیں۔ خدا کا وعدہ اپنے بندوں سے سچا ہے، وہ اپنے ارادوں میں پختہ

ہے۔لہٰذا جس کسی نے جب بھی رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی اِس کتابِ حکمت نے اُس انسان کو صراطِ مستقیم ضرور دکھائی۔

کیا وجہ ہے' کہ آج کا مسلمان بالخصوص اور عام انسان بالعموم جس کو دعوت حق پہنچی یا نہیں پہنچی مگر اُس نے اسے قابلِ قبول نہیں سمجھا؟ وہ جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں بھٹک رہا ہے۔جس قرآن کی تعلیم نے نوعِ انسانی کی قسمت بدل ڈالی تھی وہ آج بھی موجود ہے لیکن ہم اب وہ انساں نہیں ہیں۔اپنی ہی ذات کے بھنور میں غلطاں و پیچاں عمر کی گھڑیاں بِتا دیتے ہیں۔ذرا غور کریں تو یہ مسئلہ بھی قرآنِ کریم خود بیان کرتا ہے کہ لوگ اس دعوتِ حق کو کیوں جھٹلاتے ہیں؟ اُس کو نا قابلِ عمل قرار دے کر کیوں دُور ہو جاتے ہیں۔قرآن کی رو سے:

1۔تقلید اور اسلاف پرستی کی دعوت دینے والے شیطان ہیں۔(31:21 لقمان)

(شیطان کے لفظی معنی ہیں رُکاوٹ کھڑی کرنے والا، راستہ روکنے والا۔وہ کوئی انسان بھی ہو سکتا ہے اور کوئی نظام بھی)

2۔انسان کے بعض دوست شیطان ہوتے ہیں یعنی صاف کھُلی ہوئی حقیت کو سمجھنے نہیں دیتے۔(29۔28' فرقان)

3۔مذہبی پیشوائیت لوگوں کو توہم پرستی میں رکھتی ہے تا کہ اس طرح اپنے مفاد حاصل کر سکیں یہ شیطانی روش ہے (9:34:انبیاء)۔

4۔اُس شخص سے زیادہ جھوٹا کون ہے۔جو لوگوں کو بلا تحقیق گمراہ کرے بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔(4:44)۔

قرآن جو شمعِ ہدایت ہے وہ حکمت کی باتیں یوں ہی سمجھا تا چلا جاتا ہے۔سوچئے اگر کوئی شخص قرآن کے متعلق' یہ نظریہ قائم کر لے کہ یہ نا قابلِ فہم و ادراک کتاب ہے اور اس پریکٹیکل، سائنسی دَور میں کس کے پاس اتنا وقت پڑا ہے کہ وہ قرآن کو سمجھنے کے لئے سارا وقت لگائے اور ہم نے کوئی مولوی بھی نہیں بننا' تو پھر اتنی محنت کی کیا ضرورت ہے؟ ابھی بڑی عمر پڑی ہے اِن کاموں کے لئے پہلے وہ کریں جس کی ضرورت ہے۔دوسری جانب عالم شوق یہ ہو کہ وہ تمام دنیاوی علوم حاصل کر لیے جائیں جن سے اُس کو فائدے حاصل ہو سکتے ہیں پھر حد و درجہ محنت کر کے اُن علوم میں ماہر بن جائے' اُن زبانوں پر جو کہ اُن علوم کو حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں اُن پر بھی عبور حاصل کر لے اُس کے بعد دین کے متعلق ان نظریات کا پرچار کرے کہ مجھے تو ہدایت خدا نے دینی ہے اگر چاہے تو دے دے' نہ چاہے تو نہ دے۔یعنی میرا ارادہ و اختیار نہیں ہے تو یہ سوچ قرآنی نظریہ کے سراسر خلاف ہے۔لہٰذا ایسے شخص کو قرآن کیا ہدایت دے گا؟

قرآن کا پہلا مطالبہ ہے کہ پڑھ اپنے رَب کے نام سے جس نے قلم سے علم حاصل کرنا سکھایا۔جس نے انسان میں یہ صلاحیت رکھی کہ وہ رازِ ارض و سما کا کھوج لگائے۔ہمیں مسلمان سے پہلے اچھے انسان بننے کے لئے جس تربیتی پروگرام کی ضرورت ہے وہ ہمیں صرف خدائی رہنمائی سے حاصل ہو سکتا ہے۔مومن کے مقام پر جانے کیلئے جن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اُن ہی دشوار راستوں کا مسافر مفکّر' دانشور' خدائی قوانین سے آگاہ سائنٹسٹ' معالج ہو سکتا ہے۔جسکا تقاضا یہ ہو کہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ۔(کہ تم قرآن پر غور و فکر کیوں نہیں کرتے)۔

قرآنی تعلیم مومنین کے لیے واضح کرتی ہے کہ وہ ایک امتِ واحدہ کے افراد ہیں لہٰذا اُن میں تفرقہ کیوں ہو(2:143) (3:110) مومنین سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح رہتے ہیں (3:103)۔

خدااور رسول ﷺ (نظام خداوندی) کی اطاعت کرو باہمی تنازعات مت پیدا کرو ورنہ تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی (8:46)۔

حقیقت یہ ہے کہ جب قرآن کو پسِ پشت ڈال کر فرقہ بندی کر لی گئی تو پھر عوام الناس تو ان کی تقلید میں آگے بڑھتی چلی گئی۔ لہٰذا یہ بحثِ لاحاصل ہے اُمتِ مُسلمہ اقوام عالم میں اپنی انتہائی سنہری تاریخ رقم کرنے کے بعد کیسے زوال پذیر ہوئی ؟ کیا محرکات تھے؟ کیسی کیسی سازشیں کی گئیں اور کس طرح قرآن ہمارے ہاتھوں سے لے کر غلافوں اور طاقوں میں سجا دیا گیا۔ یہ تاریخ ساڑھے تیرہ سو سال پر محیط ہے۔ لیکن یہ حقیقت آج بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر اپنے یقین محکم سے ہٹ جانے کے بعد۔ جب جہالت و گمراہی کے زہریلے ناگ ہمارے رگ و پے میں داخل ہو گئے۔ یوں رفتہ رفتہ جس اُمت کو تیار کیا گیا تھا انسانوں کی بھلائی کے لیے اور جو نیکی کا حکم دیتی تھی اور بُرائی سے روکتی تھی۔ وہ بے عملی کا شکار ہو کر تقدیر کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی۔ آج وہ اپنی قسمت کا حال نجومیوں، پامسٹ، ستاروں سے یا علم اعداد کے ذریعے معلوم کر کے صبر و شکر کی چادر اوڑھ کر غلامی اور محکومیت کی دلدل میں دھنسی ہوئی ہے۔ مذہبی پیشوائیت (مُلّا، پیر، مفتی، واعظ) جس نے اِسلام اور مسلمان کا تشخص مٹا دیا ہے، جنہوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر، دنیا میں برتری حاصل کرنے کی غرض سے لوگوں کے جذبۂ علم و عمل کو تھپکیاں دے کر سُلا دیا ہے کہ جتنا ہم تمہیں سمجھا دیتے ہیں اسی پر اکتفا کرو، تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ سوال جواب کرنے کی اجازت نہیں ہے اس سے دائرہ اسلام سے خارج ہو جاؤ گے۔ جنت حاصل کرنے کے لیے جن اعمال کی ضرورت ہے ان کی لسٹ تیار ہے لے لیجئے اور دین و دنیا داری کے کام انکی روشنی میں انجام دیتے جایئے۔

آج امت مسلمہ میں تفرقہ ایک ضروری عمل ہے جس کو عین شریعت کے مطابق سمجھا جانے لگا ہے کسی بات پر اختلاف تو صحت کی نشانی ہے لہٰذا دین پر اختلاف میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس زوال شدہ امت کو، اگر کبھی اپنے اسبابِ زوال پر غور کرنے کا خیال آئے تو شاید جب تک مہلت کا وقفہ قانونِ مکافاتِ عمل کے تحت گزر چکا ہو۔ لہٰذا اب بھی وقت ہے اگر ہم اللہ کی رسی (قرآنِ کریم) کو مضبوطی سے پکڑنے کی کوشش کریں اور اپنے اعمال و افکار کو ہم آہنگِ قانونِ خداوندی کر لیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری اگلی نسلیں وہ سنہری دَور نہ دیکھ سکیں۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے!
وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

(اقبال)

نفیسہ فریاد چاہل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(گذشتہ سے پیوستہ)

اقبالؒ کا شاہین ہو کہ پرویزؒ کا سلیم

پچھلے اور پہلے حصے میں ہم نے اقبال اور پرویز کے بیانات وتعلیمات کو اکٹھا کر کے پیش کیا تھا۔ جس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ دونوں حکماء نے قوم کی بھلائی کے لیے قرآنی اصول وضوابط کو مدنظر رکھ کر کٹھن محنت سے کیا کیا خدمات سرانجام دی ہیں اور وہ کس قدر آپس میں مشترک ہیں۔ یہ ایسا موضوع تھا کہ جسے ایک ہی نشست میں برخاست نہیں کیا جا سکتا تھا یہی وجہ تھی کہ اسے رفتہ رفتہ ماہانہ کاوش کے ذریعے سامنے لایا جا سکے۔ زیرِ نظر تحریر اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ یوں تو اکثر اوقات کہا جاتا ہے کہ جب دو بڑے آپس میں بات کر رہے ہوں تو چھوٹوں کو درمیان میں نہیں بولنا چاہیے۔ مگر ہم وہ چھوٹے ہیں جو انہی بڑوں (علامہ اقبال اور علامہ پرویز) کی تعلیمات کو باہم ملا کر خود کو انسان مان کرنا صرف یہ کہ اس میں حصہ لے رہے ہیں بلکہ ان کی آپسی گفتگو میں برابر کے شریک بھی ہیں۔ یہ شرکت قوسین میں ہوتی رہے گی اور جہاں تک نہ بولنے کا معاملہ ہے۔ ہمیں ان بزرگوں کی محفل میں اظہارِ خیال کا مکمل اختیار ہے یہ اختیار بھی اِنہی حکماء کی بدولت ہمیں حاصل ہے۔ ورنہ واقعی ہم بڑوں کی باتوں میں بولنے کو اس سے پہلے معیوب سمجھتے تھے۔ یہ سلسلہ چونکہ علامہ اقبال اور علامہ پرویز کی تعلیمات کو باہم ملا کر یہ ثابت کرنے کا ہے کہ جو لوگ عام عوام کو قرآنی تعلیمات کے ذریعے انہیں بہرحال بحیثیت انسان معاشرے میں اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگیوں کو بھی خوبصورت بنانا ہے، یہاں ان دونوں کی سوچ مشترک ہو جاتی ہے۔ یہاں علامہ اقبال اور پرویز صاحب کی پیش کردہ تعلیمات کہیں نا کہیں ایک ہی خاکہ پیش کرتی ہیں۔ جیسا کہ: پیٹ بھرنے کے لیے بنی ہوئی روٹی کا سائز، بنانے کی ترکیب یا اس کے ساتھ کسی چیز کو ملا کر کھانے کا دنیا بھر میں اپنا اپنا طریقہ ہے مگر یہاں آ کر ہر خالی پیٹ والے کی سوچ دنیا کے کسی بھی دوسرے خالی پیٹ والے کی سوچ سے مل جاتی ہے اور پیٹ کی آگ کو مٹانے کے لیے کسی بھی طرح سے اناج کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یہاں تمام اہلِ کتاب وملحدوں کی سوچ یکساں ہو جاتی ہے۔ تو آپ اندازہ کریں کہ جو لوگ کتابِ الٰہی، قرآنِ کریم میں ڈوب ہو جاتے ہیں، ان کی سوچ کیوں آپس میں نہیں ملے گی؟

آج کا موضوع اگرچہ طویل نہیں مگر دونوں علماء کی طرف سے بہرحال واضح اور حالاتِ حاضرہ کی ضرورت پر ہر لحاظ سے پورا اترتے ہیں۔ یہ آج کل کے حالات کے لیے ویسے ہی ضروری ہے کہ جیسے پاک وہند میں بھی تھا اور زمانۂ نزولِ قرآن کے وقت بھی۔ اس حوالے سے علامہ اقبال کا جاوید نامہ سے ایک شعر ہے:

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شواز مقامِ آدمی

اقبال کی شاعری محض شاعری نہیں ہے۔ بلکہ وہ اعلیٰ پائے کی قرآنی تفسیر ہے۔ جس کی وجہ سے قرآن سیکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ اگر قرآنی آیات آپ کے دل پر دستک دیتی ہیں اور آپ کو ان کی سمجھ نہیں آ رہی تو اقبال کو پڑھیے تا کہ وہ آپ کے دل پر نازل ہو سکیں۔ یہاں تک تو تھا اقبال اور قرآن کا تعلق۔۔۔ اب آگے آیئے۔ چونکہ کڑی سے کڑی ملا کر بات بنتی ہے۔ اس لیے اقبالیات کے سٹوڈنٹس کے لیے اگلا مرحلہ تھا کہ اقبال کیسے سمجھ آئے؟ چونکہ ان کی شاعری کی زبان سادہ نہیں اور ان کے مطابق ''یہ ان پر فارسی میں اترتا ہے۔'' اگر انہوں نے اُردو میں بھی لکھا ہے تو یہ عام فہم نہیں۔ کہ جب تک راز خود پر خود کی زبان میں آشکار نہ ہوں ہم کیسے کسی کی بات سمجھیں گے؟ اس کے لیے علامہ پرویز کی تعلیمات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی قسم کی الجھنوں کو سلجھانے کی ایک ادنیٰ کاوش ہے۔ درج بالا شعر اقبال کا اور اس کی وضاحت وتشریح علامہ پرویز صاحب کے ایک ویڈیو پیغام کو یہاں نقل کرتے ہوئے کرتے ہیں۔ جس میں کہ وہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ اور بات کو پھیر پھیر کر بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کا موضوع انسانیت کی تکریم وشرف ہے اور ان الفاظ کو بار بار دہراتے ہیں تا کہ سامعین کے ذہن پر تادیر نقش رہیں۔ یہ ایسا طریقہ تدریس ہے کہ جس پر عموماً اساتذہ کو عمل پیرا ہونا چاہیے مگر یہ کتابی باتیں تھیں، کتابی ہی رہیں۔ عملاً اس کی تصویر ہمیں پرویز صاحب کے دروس اور تحاریر میں اکثر اوقات نظر آئیں۔ وہ فرماتے ہیں:

عزیزانِ من! اسے سمجھ رکھیے کہ جس معاشرے میں کسی ایک ابنِ آدم کو بھی ذلیل کیا جائے، خدا اس معاشرے سے روٹھ جاتا ہے اور اسے ہلاکوؤں اور چنگیزوں کے حوالے کر دیتا ہے کہ جاؤ اور یہاں کی پوری قوم کی عزتِ نفس کو مٹا کے اسے ذلیل کر دو۔ خدا کا بسیرا اس معاشرے میں ہوتا ہے جہاں کے گورنر کی زبان سے ایک بار سہواً ایک غیر مسلم ضمنی کے لیے نکل گیا ''خدا تجھے ذلیل کرے'' اس کے بعد جب احساس ہوا ہے تو کانپتے ہوئے آ گئے۔ بارگاہِ خلافت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس استعفیٰ جمع کروا دیا ہے۔ بہتیرا سمجھایا، بڑا قابل، بڑا دیانتدار گورنر تھا۔ اس آدمی نے کہ کوئی بات نہیں سہو ہے، کیوں چھوڑتے ہو؟ کہنے لگے سہو کی بات نہیں ہے، جو شخص کسی ایک انسان کی عزتِ نفس پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ اس کی زبان سے ذلت کا لفظ نکلتا ہے۔ تم کہتے ہو گورنر۔۔۔! میرے نزدیک تو وہ انسان کہلانے کا بھی حق دار نہیں۔ یہ چیز تھی۔

ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ ملوکیت جو ہے اسلام میں حرام ہے اور ملوکیت کے معنی ایک تو ٹھیک ہے ''وراثتی بادشاہت''۔ یہی معنی نہیں ہیں اس کے، کسی انسان کا انسان کے تابع ہو جانا۔ یہ ملوکیت ہے، یہ ہی جہنم ہے۔ ''انسان کا محکوم ہونا کسی انسان کا''۔ انسانیت کے تو معنی ہی مساواتِ انسانیہ ہے۔ تو جو مساوات میں ہے ایک جیسے شرفِ انسانیت کے مالک ہیں۔ ایک کا آقا، دوسرے کا غلام، ایک کا حاکم دوسرے کا محکوم، یہ بن جانا۔ یہ تو تخلیقِ انسانیت کے خلاف ہے۔ اور یہی چیز ہے جسے قرآن نے ملوکیت قرار دیا ہے۔ بڑے نفیس الفاظ میں' سورت نمل میں' بات تو ملکہ سبا کی زبان سے آئی ہے بڑی عجیب بات ہے۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝ (27:34)

اس نے کہا معتبروں سے کہ باور رکھو تمہیں ملوکیت کا نہیں پتہ کیا کرتی ہے؟ جب وہ کسی ملک میں آتی ہے تو الٹ پلٹ کے رکھ دیا کرتی ہے۔ وہاں کے صاحبِ عزّت لوگوں کو ذلیل کر دیا کرتی ہے۔ یہ ہے ملوکیت۔ یہ عزیزانِ من! کچھ فام آف گورنمنٹ کا سوال نہیں ہے کہ شکل کیا ہونی چاہیے اس کی۔ وراثتی بادشاہت ہے، ڈکٹیٹرشپ ہے، آمریت ہے، جمہوریت ہے، پارلیمنٹری نظام ہے یا پریزیڈینشل ہے۔۔۔ یہ کچھ نہیں ہے۔ بنیاد اس کی یہ ہے کہ کوئی بھی آپ کے ہاں شکل ہو اگر اس میں انسان کی تکریم اور عزت بحیثیت انسان ہونے کے (برابر) نہیں ہے، وہ ملوکیت ہے اور وہ معاشرہ جہنم کا معاشرہ ہے۔ ''وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ'' قرآن نے کہا ہے۔ پوری نوعِ انسانی، آدمی، انسان۔۔۔ انسان ہونے کی جہت سے ہم نے تمام انسانوں کو یکساں واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ یہ تو اعلانِ جنگ ہے خدا کے خلاف کسی انسان کو ذلیل سمجھنا، ذلیل کرنا، اس کو شرفِ تکریمِ انسانیت سے محروم کر دینا۔ خدا کہتا ہے ہم نے اس کو ایسا پیدا کیا ہے۔۔ وہ کہتا ہے ہم اس کو الٹ کے رکھ دیں گے۔ سوچیے اور کیا ہے یہ؟ اور جس معاشرہ میں یہ کیفیت ہو، میں نے عرض کیا ہے کہ جہاں انسانیت کی تذلیل ہوتی ہو وہی معاشرہ ہے جسے جہنمی معاشرہ کہا جاتا ہے اور اس کے لیے آپ کو جو اتنی لمبی تاریخ ہے قیامت کی، وہ نہیں اٹھا رکھنی چاہیے۔ میں آگے چل کر ابھی عرض کروں گا کہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ ہوتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کا سب سے بڑا کامیاب حربہ یہ ہے کہ جہنم اور اس کے عذاب کو قیامت تک اٹھا رکھیں۔ یہاں کے جہنم کو سامنے آنے ہی نہ دیں۔ آپ نے وعظ سنے ہوں گے، آپ نے خطبے سنے ہوں گے۔ ان کے ہاں کے۔۔۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ ہمیشہ وعظ کو قبر سے شروع کرتے ہیں یعنی اس دنیا سے جوں ہی الگ ہوا عذاب شروع ہوا، یہاں نہیں اور وہاں سے پھر لے جاتے ہیں قیامت تک کا جہنم۔ میں نے عرض کیا کہ قیامت اور آخرت کی زندگی تو ہمارا ایمان ہے۔ لیکن اس دُنیا کے اندر جو عذاب ہے، اس دُنیا کا جو جہنم ہے، اس کا ذکر کبھی نہیں کریں گے۔ اس کا ذکر کریں گے تو جو انسانیت شرف، عزت اور تکریم سے محروم ہو رہے ہیں۔۔۔ اسے احساس پیدا ہو جائے گا کہ ہم تو جہنم میں ہیں۔ بات ہوئی تو پھر سامنے آنی چاہیے۔ "جہنم" میں نے عرض کیا ہے کہ یہ الفاظ ہیں جس میں اس قوم کے سارے معنی پوشیدہ ہیں۔ یہ جہنم کا لفظ کہاں سے آیا؟ بنی اسرائیل جی ہنوم کہتے ہیں۔ یہ اسلام سے پہلے بنی اسرائیل کی قوم تھی نا! جن کے ہاں بہت سے انبیاء آئے۔ زبان ان کی عبرانی تھی۔ یہ جو بیت المقدس کی ساری وادیاں ہیں، ان میں یہودی بستے تھے۔ انہی کے ہاں پہلے یہ لفظ تھا۔ قرآن میں وہیں سے آیا ہے۔ بیت المقدس کے شمال میں ایک وادی تھی جہنم۔۔ جی ہنوم۔ جی ہنوم اصل میں۔ جس کے معنی وادی کے ہوتے ہیں۔ ہنوم کوئی دیوتا تھا۔ جس کے نام کی یہ وادی تھی۔ اس میں ایک دیوتا تھا ملوک (دیوتا جس بھی مذہب یا مسلک کے ہوں وہ تخیلاتی ہوتے ہیں۔ جن کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یا تو کسی انسان کو اس حد تک لے جایا جاتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس سے جوڑ کر کچھ کہانیاں گھڑ لی جاتی ہیں تا کہ لوگوں کو ورغلا کر غلط عقائد کی طرف لایا جا سکے۔ یا مائتھالوجی جس میں وہ وہ کہانیاں بنا کر پیش کر دی جاتی ہیں، جس کے

بارے میں انسانی عقل تک حیران رہ جائے۔ وحی تو دور کی بات ہے۔) نہایت خونخوار قسم کا۔ فرعونیت اور استبداد کا مجسم۔ آپ لوگوں نے تو کبھی دیکھا نہیں ہوگا شاید۔ ہندوؤں کی دیوی جو ہوتی ہے۔ کالی ماتا سارا منہ خون سے سرخ ہوتا تھا، زبان باہر کو نکلی ہوئی۔ آنکھیں خشمگیں، چار ہاتھ اور چاروں میں مختلف قسم کے اوزار پکڑے ہوئے، گلے میں انسانوں کی کھوپڑیاں ہوتی تھیں۔ یہ اس قسم کا وہاں دیوتا تھا۔ اس دیوتے کے حضور انسانوں کو ذبح کیا جاتا تھا اور پھر ان کو جلا کے اس کی راکھ اس کو پیش کی جاتی تھی۔ اس دیوتے کے حضور میں بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ تو جہنم ویسی ہی وادی جی ہنوم۔ جہنم اس معاشرے کا نام ہے کہ جس میں انسانیت ذبح کی جائے اور ان کی شرف و تکریم کو جلا کے دیوتاؤں کے بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ دیوتا خواہ وہ بادشاہ کی شکل میں ہو، حکمران کی شکل میں ہو، پیشواؤں کی شکل میں ہو، یہ ہے جہنم۔

عزیزانِ من! اسی لیے قرآنِ کریم نے بتایا ہے یہ جہنم جس میں شرفِ انسانیت جو ہے اس کی سوختنی قربانی پیش کی جائے۔ اربابِ اقتدار کے حضور۔ جن کو معبود بنایا جاتا ہے۔ یہ کہا ہے اس نے کہ آیت ترجمہ: یہ تو وہ آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ اب ہم قریب آتے جا رہے ہیں اس کے کہ جس معاشرے کے اندر بھی انسانیت کی تذلیل ہو اور ابھی میں عرض کروں گا کہ اسے محسوس کون کرتا ہے؟ اور اس کا وہ احساس۔۔۔ سوچیے کہ پھر اس کا نفس کس قسم کے شعلوں کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ سوچیے قرآن سے جہنم کی تفصیل کہ اس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیا کرتے ہیں۔ تو پہلی چیز یہ آ گئی کہ جس معاشرے کے اندر کسی ایک انسان کی بھی عزتِ نفس محفوظ نہ رہے۔ اس کی شرفِ انسانیت، سوختنی قربانی کی طرح ان کی بھینٹ چڑھا دی جائے اوپر والوں کی۔ تکریمِ انسانیت سے محروم ہو جائے ایک فرد بھی۔۔۔ وہ معاشرہ جہنم کا معاشرہ ہے۔ جہنم کہتے ہی اسے ہیں کہ وہاں کے دیوتے کا نام ملوک ہوتا ہے اور آپ کو پتہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جہنم کے داروغے کا نام مالک ہے۔۔۔؟ ماسٹر، انسان کا ماسٹر ہونا دوسرے انسان پر۔ میں نے عرض کیا ملوکیت میں یہ چیزیں ہیں۔ اسلام میں ملوکیت نہیں ہے صاحب۔ ملوکیت کے معنی بس کر دیئے کہ وراثتی حکومت بادشاہت ہے۔ یہ نہیں ہے وہ (ملوکیت) وہ بھی قصۂ پارینہ ہے کہ آج تو ہر جگہ آپ کے ہاں موجود ہے۔ بہرحال اتنے کا نام ملوکیت نہیں ہے، ملوکیت (یہ ہے کہ) جہنم کے داروغے کا نام مالک ہے، وہاں سے ملوکیت ہے۔ انسانوں کا انسانوں کا غلام ہونا، محکوم ہونا، ان کے تابع فرمان ہونا۔۔۔ یہ ہے جہنم۔

ضرورت رشتہ

ایک بیٹی جس کی عمر 33 سال ہے تعلیم ماسٹرز ہے اور بھائیوں کے ساتھ مل کر کراچی میں اسکول چلا رہی ہیں۔ ان کے لئے صاحب روزگار تعلیم یافتہ کا رشتہ درکار ہے جن کی عمر 39 سال تک ہو۔ خواہش مند درج ذیل نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں:

03463512995

سانحہ ارتحال

ایک اور میر کارواں چل بسا۔۔۔۔۔جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں۔۔۔۔۔

بزم ٹورانٹو کے نمائندہ محترم عمران شاہد صاحب نے یہ انتہائی افسوس ناک خبر نمائندگان گروپ میں شیئر کی، کہ بزم ٹورانٹو کے دیرینہ کارکن، بزم ٹولیڈو اوہائیو کے نمائندہ اور ادارہ طلوع اسلام لاہور کے وائس چیئرمین، پروفیسر ڈاکٹر منصور عالم صاحب، اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نبھاتے ہوئے، ایک طویل عرصہ علالت کے بعد 24 جون کو قبل از دوپہر اس جہان فانی سے رحلت فرما کر دارالبقا کی طرف رخصت ہوئے۔ اس دل خراش خبر کے پڑھنے سے دلی صدمہ پہنچا۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی وفات سے حلقہ قرآنی میں آج سوگ کا عالم ہے۔ ان کی وفات صرف ان کے اہل خانہ اور عزیز و اقارب کے لئے ہی نہیں بلکہ طلوعِ اسلام کے ہر رکن کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے۔



ڈاکٹر منصور عالم صاحب اگرچہ اب جسمانی طور پر ہمارے درمیان نہیں رہے۔ لیکن جب تک علامہ پرویز صاحب کے ویڈیو دروس قرآن سنے اور دیکھے جاتے رہیں گے تو نہ صرف ہم بلکہ ہمارے آنے والی نسلیں بھی قرآن کی ترویج و اشاعت کے لئے ان کے کئے ہوئے کام کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو اپنے درمیان موجود پائیں گی۔ ڈاکٹر صاحب اپنی ذات میں ایک ادارے اور ایک اکیڈمی کی حیثیت رکھتے تھے اور قرآن خالص کا پیغام نئی نسل تک پہنچانے میں ان کا کردار لاثانی ہے۔ نارتھ امریکہ میں قرآنی شمع سے انہوں نے اندھیرے قلوب کو ابدی روشنی سے روشناس کروایا اور یہ روشنی وقت کے ساتھ ساتھ پھیلتی رہے گی۔

ادارہ طلوع اسلام اور تمام بزمہائے طلوع اسلام پروفیسر ڈاکٹر منصور عالم صاحب کی وفات پر ان کے اہل خانہ کے ساتھ ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اور ہم سب دست بہ دعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کے اقرباء کو اس عظیم سانحہ کے برداشت کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے آمین۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی (اقبالؒ)

خورشید انور (چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام)

انتہائی غم واندوہ سے بوجھل دل کے ساتھ احباب کو مطلع کیا جاتا ہے کہ بزمِ ٹورانٹو کے دیرینہ رفیق بزمِ ٹولیڈو اوہائیو کے نمائندہ اور ادارہ طلوعِ اسلام لاہور کے وائس چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر منصور عالم ایک عرصہ کی طویل علالت کے بعد آج 24 جون کو قبل از دوپہر اس جہانِ فانی سے رخصت فرما گئے ڈاکٹر صاحب نہایت حلیم الطبع، بردبار، ہنس مکھ اور دلکش شخصیت کے مالک انسان تھے قرآنِ کریم انسان کی جس قسم کی کردار سازی کرنا چاہتا ہے وہ اُس کا ایک دل آویز پیکر تھے۔

1980ء میں بزمِ ٹورانٹو کی تشکیل کے بعد جن پاکیزہ سیرت وکردار کی حامل شخصیات نے قرآنی فکر کی توسیع وترویج کے لیے بزمِ ٹورانٹو کی راہنمائی فرمائی ان گرامی قدر احباب کی فہرست میں ڈاکٹر منصور عالم صاحب کا اسم گرامی سرفہرست آتا ہے ۔قرآنی فکر کو وہ جس عمدگی سے سمجھتے تھے اور جس حُسن وخوبی سے اُسے دوسروں تک پہنچاتے تھے آج اس دور میں اُس کی مثال بہت کم ملے گی۔ ڈاکٹر صاحب مفکرِ قرآن جناب پرویز علیہ الرحمہ کے دروس القرآن پر مشتمل اکتالیس میں سے سینتیس جلدوں کی انگریزی زبان میں ٹرانسلیشن کا کام مکمل کر چکے تھے۔ قرآنی تعلیمات پر مبنی بے شمار مضامین جو امریکہ بھر کے مختلف انگریزی جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ان کا پرویز صاحب کے تقریباً ''ڈیڑھ سو ویڈیو دروس پر سب ٹائٹلز کا کام ایک عظیم کارنامہ ہے۔ ان کی مسلسل جدوجہد اور انتھک کوششوں کے نتیجے میں آج نارتھ امریکہ میں قرآنِ خالص کی جو آواز سنائی دیتی ہے اُسے بلند اور عام کرنے میں ڈاکٹر منصور عالم صاحب کا ایک منفرد مقام ہے موت وحیات کا سلسلہ خدا کے اٹل قوانین کا پابند ہے قاضیٔ تقدیر کے بے لچک فیصلے نہ کسی کی مقدس آرزوں کی رعایت کرتے ہیں اور نہ زخم خوردہ جذبات سے ہمدردی کے روادار ہیں ڈاکٹر منصور عالم ایسے ہی بے لچک فیصلے کو لبیک کہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ایک وسیع حلقۂ احباب کو ٹھنڈی آہوں اور گرم گرم آنسوؤں کی سوگوار فضاء میں وقفِ اضطراب چھوڑ گئے ہیں۔ بزمِ ٹورانٹو محترم ڈاکٹر منصور عالم صاحب کے پسماندگان کی خدمت میں دلی پیغامِ تعزیت پیش کرتی ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

آئیں گی بہاریں بھی گلشن بھی ہرے ہوں گے وہ رنگ کہاں ہوگا اے لالۂ صحرائی!

عمران شاہد

افسوس کہ ایک اور شمع بجھ گئی

ڈاکٹر محمد یونس جاوید صاحب، نمائندہ بزم غلام محمد آباد، فیصل آباد کی وفات کی افسوس ناک خبر پڑھ کر انتہائی دکھ اور افسوس ہوا۔ ویسے تو فکرِ قرآنی کا ہر ایک رکن تحریک طلوع اسلام کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ مگر نمائندہ اپنی بزم کا مرکزی ستون اور وحدت کی علامت ہوتے ہیں۔ ان کی وفات تحریک طلوع اسلام کے لئے ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطاء فرمائیں اور پسماندگان ولواحقین کو صبر جمیل عنایت فرمائیں۔ ادارہ مرحوم کے پسماندگان، لواحقین، اور احباب بزمہائے فیصل آباد کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ خورشید انور (چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام)

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20X30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	ہدیہ
سورۃ الفاتحہ	(1)	240	200/-
سورۃ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-
سورۃ البقرہ (اوّل)	(2)	500	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-
سورہ آل عمران (اوّل)	(3)	472	500/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-
سورۃ الانفال	(8)	210	250/-
سورۂ توبہ	(9)	530	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-
سورۂ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-14-15)	500	500/-

سورۃ النحل	(16)	334	300/-
سورۃ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-
سورۃ الکہف، سورۃ مریم	(18-19)	532	500/-
سورۃ طٰہٰ	(20)	416	350/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ العنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ روم، لقمان، السجدہ	(30-31-32)	444	400/-
سورۃ الاحزاب، سبا، فاطر	(33-34-35)	570	400/-
سورۃ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورۃ الصفٰت، ص، زمر	(37-38-39)	450	400/-
سورۃ مومن حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40-41-42)	624	550/-
سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45-46-47)	520	500/-
سورۃ الفتح، الحجرات، قٓ، الذاریات، الطور، النجم	(48-49--51-50-52-53)	550	500/-
سورۃ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55-56-57)	384	400/-
28واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	-64-65-66) (58-59-60-61-62-63	300	300/-
29واں پارہ (مکمل)		544	400/-
30واں پارہ (مکمل)		624	400/-
شرح جاوید نامہ		800	1200/-
فہرست موضوعات مطالب القرآن فی دروس الفرقان		800	1000/-

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردِ مومن	مقام محمدی ﷺ	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرحِ جاوید نامہ شائع ہوگئی!

مفکرِ قرآن غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ کے لیکچرز کی تحریر پر مشتمل اپنے انداز کی منفرد شرح جاوید نامہ شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے 800 صفحات پر مشتمل اِس یکتائے روزگار شرح کی قیمت صرف بارہ سو روپے ہے۔ ''جاوید نامہ'' کیا ہے اس کے متعلق پرویز علیہ الرحمۃ کی زبانی خود ملاحظہ فرمائیے:

''علامہ اقبالؒ کی فارسی کی کتاب ہے ''جاوید نامہ''۔ اگر آپ نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا' مبالغے کی بات نہیں ہے' یہ ایک کتاب ''جاوید نامہ'' پڑھا دیجئے لیکن اس کے پڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کی یا ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو علومِ حاضرہ کے اوپر پوری دسترس رکھتا ہو۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ اقبالؒ کی فکر کا شاہکار ہے۔ تاریخ عالم پہ نگاہ' مذاہبِ عالم پہ نگاہ' سارے فلسفے کے اوپر نگاہ' الٰہیات کے اوپر نگاہ' سوشیالوجی کے اوپر نگاہ' تمدن کے اوپر نگاہ' نظام کے اوپر نگاہ' سب سے بڑی یہ چیز کہ قرآن کی گہرائیوں کے اوپر بڑی نگاہ۔ اگر کہیں یہ چیز نصاب کی اس انداز سے سامنے آئے پھر آپ دیکھئے گا کہ انہی نوجوانوں کی ذہنیت کیسے بنتی ہے اور کیا بنتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ کوئی دوسری قوم آئے گی۔ بڑا حسین انداز ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں وہ اس انداز سے بات شروع کرتا ہے کہ یہ نظام آیا تو ملوکیت بھی گئی اور یہ پاپائیت بھی گئی اور سرمایہ داری بھی گئی یہ سب چیزیں انہوں نے اُڑا دیں۔ میرے دل کے اندر جو بات چھپی ہوئی ہے آج میں اسے بے نقاب کہہ دینا چاہتا ہوں۔ الفاظ نہیں مل رہے یہ کہنے کے لیے کہ میں کیا کہوں کہ یہ قرآن ہے کیا' یہ کتاب تو نہیں کچھ اور ہی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب جان کے اندر کسی کے یہ اتر جاتی ہے تو جان بدل جاتی ہے اور جب جان بدل جاتی ہے تو دنیا بدل جاتی ہے''۔

(بحوالہ دروس القرآن سورۃ المائدہ آیات 51 تا 56)

اہم نوٹ: پی ٹی سی ایل کے لینڈ لائن نمبر صرف دفتری اوقات کے لیے ہیں۔ لینڈ لائن رابطہ نمبر خراب ہونے کی صورت میں یا چھٹی کے دن/وقت آپ سیل فون نمبر پر ٹیکسٹ/وٹس ایپ میسیج کر سکتے ہیں۔

آپ سے درخواست ہے کہ اپنا مدعا تفصیلی طور پر ایک ہی میسیج میں لکھ دیجئے۔ شکریہ

منگوانے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) 25-بی، گلبرگ 2، لاہور فون نمبرز: +92 42 3571 4546, +92 310 4800 818
+92 318 4271 465, +92 331 4763 936

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور سُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔



(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)



PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.77
ISSUE
08

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam

